إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

مارچ ۲۰۱۴ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۸، شمارہ ۴، مارچ ۲۰۱۴ء/ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ

## مشمولات

○پاکستان اور اسلام

| | | |
|---|---|---|
| اس معاشرے اور ملک پر رحم کیجیے | مدیر | ۴ |

○تعلیم و تربیت

| | | |
|---|---|---|
| قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کا ایک قابلِ عمل منصوبہ | افتخار الدین منصور | ۶ |

○تزکیۂ نفس

| | | |
|---|---|---|
| ذکر انسانی شخصیت کو بدل دیتا ہے | احمد جاوید | ۳۴ |

○اسلامی تحریکیں

| | | |
|---|---|---|
| تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے | جمیل الرحمن عباسی | ۲۵ |

○ فقہ و قانون

| | | |
|---|---|---|
| مسلم ممالک کے باشندوں کے لیے بلاد کفار کی شہریت غیر شرعی ہے | ڈاکٹر محمد امین | ۳۲ |

○اسلام اور مغرب

| | | |
|---|---|---|
| مادی ترقی کا لازمی نتیجہ شناخت کا بحران | محمد ظفر اقبال | ۴۱ |

○مغربی تہذیب

| | | |
|---|---|---|
| لبرل ازم کیا ہے؟ | ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری | ۴۹ |

○تبصرۂ کتب

| | | |
|---|---|---|
| دینی جماعتوں اور تحریکوں کی انا پرستی | پروفیسر طارق بٹ | ۵۷ |

فکر و نظر

# اس معاشرے اور ملک پر رحم کیجیے

پاکستان میں ایسی قوتیں علی الاعلان کام کر رہی ہیں جو اس معاشرے اور ملک کو اس کی نظریاتی بنیادوں سے ہٹا کر یہاں مغربی فکر و تہذیب اور اس کی اقدار کو فروغ دینے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اسلام اور پاکستان کے دشمن ایسا اس لیے چاہتے ہیں تا کہ یہ ملک خدانخواستہ کمزور ہو جائے اور ٹوٹ جائے......اور جو مقامی عناصر اس کارتخریب میں شریک اور مصروف ہیں وہ یا تو مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر ہیں اور اسے ہی دنیا میں کامیابی اور طاقت کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں یا پھر حب جاہ و مال اور دنیاوی مفادات کی خاطر دشمنوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔

ہم گول مول بات کرنے کی بجائے اور لگی لپٹی رکھے بغیر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس اسلام، مسلم اور پاکستان دشمنی کے پیچھے امریکہ، یورپ اور اسرائیل کا ہاتھ ہے، بھارت ان کا آلۂ کار ہے اور افغانستان کی سرزمین کو وہ ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان میں جو لوگ ان کے لیے کام کر رہے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

- سیاسی میدان میں ایم کیو ایم، معاشرتی و ثقافتی شعبوں میں اکثر میڈیا مالکان اور ان کے چنیدہ اینکرز و کالم نگار اور مذہبی حلقوں میں سے بعض بریلوی و شیعہ گروپ اس مقصد سے علانیہ اور زور شور سے مصروف عمل ہیں۔

- کچھ افراد اور ادارے اس مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن سبھاؤ اور حکمت عملی سے جیسے انتظامیہ میں سے سول اور فوجی بیوروکریسی اور سیاسی جماعتوں میں سے پیپلز پارٹی و اے این پی وغیرہ۔

- حکومت کا کردار یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہی ہے اور بے حس ہے، وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کو تیار نہیں۔

سوال یہ ہے کہ حکومت کا یہ طرز عمل کیوں ہے؟ مثلاً امریکہ اور اس کی سرپرستی میں بھارت بلوچستان، کراچی اور قبائلی علاقوں میں بدامنی اور شورش میں ملوث ہے۔ مذہبی دہشت گردی کے پیچھے بھی انہی کا ہاتھ ہے۔ کئی حکومتی ذمہ داران اسے سرعام تسلیم کر چکے ہیں۔ لیکن حکومت ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے بات نہیں کرتی اور ان سے نہیں کہتی کہ ختم کرو یہ جھنجھٹ ورنہ......اور نہ ان کے

مقامی حمایتیوں اور ایجنٹوں پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ بلاشبہ ہماری معاشی حالت پتلی ہے۔ امریکہ و یورپ سے پنگا لینا آسان نہیں اور دوسری بہت سی نزاکتیں بھی ہیں لیکن آخر یہ سب کس قیمت پر؟ کیا ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سالمیت کی قیمت پر؟ نہیں صاحب! کوئی زندہ اور غیرت مند قوم یہ قیمت ادا نہیں کرتی۔ یہ تو صریحاً خودکشی ہے، بے حمیتی ہے اور اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارنا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ دینی جماعتیں اور ادارے بھی اس کارتخریب کا ایک حصہ ہیں لیکن ہماری رائے میں ان کی اکثریت اس صورتِ حال کے خلاف جدوجہد کے شعور سے محروم ہے اور بے عمل ہے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں کہ تعلیم جس رخ پر جاری ہے اور میڈیا جو گل کھلا رہا ہے اس کے نتیجے میں دس بیس سال بعد معاشرے کی کیا حالت ہو جائے گی۔ اسلامی اصول واقدار ہمارے معاشرے میں کتنے غیر مانوس اور اجنبی ہو جائیں گے اور ان کی جگہ مغربی اصول واقدار کا چلن عام ہو جائے گا اور دینی افراد، جماعتیں اور ادارے سمندر میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی صورت اختیار کرلیں گے اور دن بدن سکڑتے اور سمٹتے چلے جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ طوفان کا کوئی بڑا ریلہ انہیں بہا لے جائے۔

اس دلدل سے نکلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں اس مشکل صورت حال اور اس کے ہولناک نتائج کا ادراک ہے وہ اکٹھے ہو جائیں اور مل کر:

۔ حکومت پر دباؤ ڈالیں اور اس کے لیے ہر ذریعہ اختیار کریں کہ حکومت اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو جائے اور غیر ملکی طاقتوں کو مجبور کرے کہ وہ اسلام اور پاکستان دشمنی سے باز آ جائیں اور ان کے مقامی حمایتیوں اور ایجنٹوں کی اصلاح اور بیخ کنی کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کرے اور اسے حکمت سے نافذ کرے۔ ذہن سازی کے اداروں خصوصاً تعلیم اور میڈیا کا قبلہ درست کرے اور ملکی اداروں کی قلب ماہیت اور اصلاح وتربیت کے لیے مختصر اور طویل مدتی اقدامات کرے۔

۔ صرف حکومت کو توجہ دلانے اور اس پر انحصار کرنے کی بجائے اسلام اور پاکستان کے یہ حامی خود بھی میدانِ عمل میں اتریں اور جماعتی اور ادارہ جاتی تنگنائیوں سے نکل کر اسلام اور پاکستان کو بچانے کے لیے متحد ہو جائیں، خصوصاً ذہن سازی اور تعمیر شخصیت کے لیے تعلیم وتربیت اور میڈیا کے شعبوں میں کام کریں اور ریاستی اداروں کی اصلاح وتعمیر پر فوکس کریں تو اچھے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

تعلیم و تربیت

افتخار الدین منصور ☆

# قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کا ایک قابلِ عمل منصوبہ

## ہم ۱۴ سال کے اندر پوری قوم کو تعلیم یافتہ اور ہنرمند بنا سکتے ہیں

پاکستانی قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے ہم جناب افتخار الدین منصور صاحب کا منصوبہ طبع کر رہے ہیں۔ آخر میں ان سے مختصر ڈائیلاگ بھی ہے۔ ہم اس پر ماہرین تعلیم و اہل دانش کے تبصرے و تنقید کو خوش آمدید کہیں گے۔ ادارہ

### مقاصدِ تعلیم

(۱) تعلیم کا بنیادی مقصد معرفتِ ذات ہے۔ ہر شخص اپنے امکانات جان کر شخصیت کی تشکیل جدید کے قابل ہو جاتا ہے، یہی خود گر و خود گیر شخصیت ماحول کے ساتھ مکالمے سے اپنی راہ متعین کر سکتی ہے۔

تخلیق و تجدید کا سرچشمہ بھی فرد ہی ہے۔ معاشرہ اس کے لیے ماحول مہیا کرتا ہے، ایسا ماحول جس میں آزادیٔ فکر و تحقیق کی مضبوط روایت موجود ہوتی ہے۔

افراد ہی زمانوں کے نمائندہ ہوتے ہیں، معاشرہ انہیں نشوونما کے لیے وسائل مہیا کرتا ہے۔ جو معاشرے مسلسل کسی غزالی، کسی آئن سٹائن کو پیدا نہیں کرتے رہتے وہ جمود کا شکار ہو کر کالعدم ہو جاتے ہیں۔

افراد ہی کے باہمی تعلق سے معاشرہ نشوونما پاتا ہے، افراد کے باہمی تعلق سے حسنّ اخلاق پیدا ہوتی ہے جس کا تعلق گہرے انسانی شعور سے ہے۔ حسنِ خُلق سے مزین افراد صحت مند معاشرہ کے قیام کا باعث بنتے ہیں۔

عقیدہ، یقین، مقصدیت اور پہل کرنے کی ہمت۔ ایسی خصوصیات ہیں جو فرد کی زندگی کو بامعنی بنا کر تخلیقی عمل کو ابھار سکتی ہیں۔

(۲) ملی نظام تعلیم کا دوسرا بڑا مقصد تہذیبی ورثے، علمی روایت اور بنیادی مقاصد کو تنقیدی جائزہ کے بعد اگلی نسل کو منتقل کرنا ہوتا ہے تا کہ اجتماعی زندگی کی تخلیقی تعمیرِ نو کا تسلسل برقرار رکھا جا سکے۔

---

☆ ۴۲ جے/۲ واپڈا ٹاؤن لاہور فون ۳۵۱۸۳۴۴۲-۰۴۲، ۴۹۶۲۵۷۰-۰۳۲۱

(۳) علوم طبعی بھی ہیں اور روحانی بھی، شخصیت کی متوازن تعمیر کے لیے دونوں کے امتزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان نہ کائنات کے حوالہ کے بغیر رہ سکتا ہے نہ وراءالکائنات کے!

طبعی علوم کی نفی سے رہبانیت پیدا ہوتی ہے، انسان اچھی زندگی کے وسائل سے محروم ہوجاتا ہے، روحانی علوم کی نفی سے وحشت پیدا ہوتی ہے، انسان وسائل کے زیادہ سے زیادہ حصول کی آویزش میں مبتلا ہوکر ایک متوازن اور پُرامن معاشرتی زندگی سے محروم ہوجاتا ہے۔ انفس وآفاق میں توازن فلاحِ انسانیت کی راہ ہے۔

(۴) ہمارا نظام تعلیم ہماری اپنی تہذیب وثقافت، ہماری اپنی تاریخی روایت اور کائنات کے بارے میں ہمارے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ہونا چاہیے۔ کسی بھی دوسرے نظام کی نقالی مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔

(۵) معاش انسانی زندگی کے قیام کے لیے لابدی ہے، لیکن یہ مقصدِ حیات نہیں، ذریعۂ حیات ہے۔

انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے باہمی تبادلۂ اشیاء وخدمات سے معاشی وسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان وسائل کا معیار افراد کی علمی وثقافتی سطح کے مطابق ہوتا ہے۔

اس غرض کے لیے تعلیم کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ معاشرے کی سائنسی وتکنیکی ضروریات کو بھی پورا کرے تاکہ افراد اپنی روزی عزت ووقار سے حاصل کرسکیں۔

یہ سارا عمل تعلیم وتعلم کے بغیر ممکن نہیں، جو معاشرے اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے پس ماندہ رہ جاتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کی صورتِ حال یہ ہے کہ:

۱۔ ہم تعلیمی لحاظ سے دنیا کے پست ترین ممالک میں شامل ہیں۔

۲۔ ہمارے تعلیمی اخراجات کم ترین سطح پر ہیں۔

۳۔ تعلیمی مسئلہ حل کرنے کے لیے سیاسی ارادہ مفقود ہے۔

۴۔ چھیاسٹھ سال گذر گئے ہیں، آبادی بڑھ رہی ہے اور (عملاً) تعلیم گھٹ رہی ہے، معاشرتی و معاشی حالت ناگفتہ بہ ہے، تشدد دن بدن حاوی ہورہا ہے اور دور کسی افق پر بھی روشنی کا پتہ نہیں۔

۵۔ سیاستدانوں کی ترجیحات مختلف ہیں، ہر جگہ حکومت کی بالادستی قائم نہیں، خلا کو جب دوسرے

پُر کریں تو فساد پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ ایسے میں ایک ہی محفوظ راستہ ہے۔ معاملے کو عوام کے پاس لے آیا جائے، عوام میں احساس زیاں ابھار کر حالات سدھارنے کے لیے کہا جائے، حالات سدھارنے کی جب بھی بات ہوگی، تعلیم شمار ایک پر ہوگی۔

۷۔ اگر آج ہمارے اندر تعلیم حاصل کرنے کے لیے اجتماعی ارادہ پیدا ہو جائے تو ہم ان شاء اللہ اپنے وسائل کے استعمال سے چودہ سال کے عرصہ میں پوری قوم کو تعلیم یافتہ اور ہنر مند بنا سکتے ہیں۔

## نظام تعلیم

۱۔ ابتداء میں تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

(ا) با قاعدہ تعلیم: چار سال کی عمر میں ہر بچہ مدرسہ میں داخل ہوگا اور وہ چودہ سال کی لازمی تعلیم حاصل کرے گا۔

(ب) ہنگامی تعلیم: i- انیس سے پچاس سال کی عمر کے اصحاب کے لیے

ii- پچاس سال سے بڑے اصحاب کے لیے۔

۲۔ (ا) پہلے قدم کے طور پر مناسب قانون سازی کے ذریعہ اٹھارہ سال عمر سے کم بچے کو کسی گھر یا دوکان یا کاروباری ادارہ یا کاشتکاری کے کسی مقام پر ملازم رکھنے کو جرم قرار دے دیا جائے گا۔ خلاف ورزی کرنے پر سزا ملازم رکھنے والے کو دی جائے گی۔

(ب) والدین بچے کو مدرسہ میں داخل کرانے اور با قاعدگی سے مدرسہ میں بھیجنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ بغیر معقول وجہ کے غیر حاضری پر والدین سے پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ ماحول میں نگہداری کا ایک انتظام کیا جائے گا کہ اوقاتِ مدرسہ میں کوئی طالب علم گلی محلوں میں پھرتا ہوا نہ پایا جائے۔

۳۔ ابتدائی لازمی تعلیم چودہ سالوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ بچہ چار سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل ہوگا اور ایک سال بچہ کی مدرسہ کے ماحول سے انسیت پیدا کرنے لیے ہوگا۔ بچوں کے پس منظر کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے انہیں مدرسہ میں با قاعدگی سے آنے اور تفریح و تعلیم کے مناسب امتزاج سے مدرسہ میں مصروف رہنے کی طرف مائل کیا جائے گا۔ دو پہر کو خوراک (دودھ اور بسکٹ وغیرہ) کا انتظام ہوگا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ بچے میں آوارہ پھرنے کے بجائے مدرسہ آنے کی ترغیب و عادت پیدا کی جا سکے، کم عمر، ماحول کی خوبصورتی، پیار، ضرورت کی طرف دھیان اور ہم عمر بچوں کا اجتماع...... یہ عناصر ذہنوں کی

بنانے اور بدلنے میں مدد دیتے ہیں۔

تیرہ سال کی لازمی تعلیم کے بعد جو بچے مزید تعلیم (طب، ہندسہ، معیشت، انتظامیہ وغیرہ) کے لیے اعلیٰ تعلیمی اداروں یا جامعات میں چلے جائیں وہ تکمیل تعلیم کے بعد معاشرے میں واپس آئیں گے۔

جو اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرنا چاہیں یا تعلیمی نتائج کے مطابق ایسا نہ کر سکتے ہوں، انہیں ایک سال کی خصوصی پیشہ ورانہ تربیت (بڑھئی، مستری، الیکٹریشن وغیرہ) دی جائے گی۔

۴۔ اٹھارہ سال کی عمر کے تمام بچے باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکیں گے۔

(۱) ۴ سال کا بچہ ابتدائی جماعت میں داخل ہو کر ۱۳/ ۱۴ سال کی لازمی تعلیم حاصل کرے گا۔

(۲) ۵ سال کا بچہ ابتدائی + پہلی جماعت کا خصوصی نصاب ۱ سال میں مکمل کر کے ۶ سال کی عمر میں دوسری جماعت میں داخل ہو کر لازمی تعلیم پوری کرے گا۔

(۳) ۶ سال کا بچہ (۱+۲)..........کا خصوصی نصاب ۱ سال میں مکمل کرے گا اور ۷ سال کی عمر میں جماعت ۳ میں داخل ہوگا۔

(۴) ۷ سال کا بچہ (۱+۲)، ۱ سال (۳+۴)، ۱ سال، ۹ سال کی عمر میں جماعت ۵

(۵) ۸ سال کا بچہ (۱ تا ۳)، ۱ سال (۴-۵)، ۱ سال، ۱۰ سال کی عمر میں جماعت ۶

(۶) ۹ سال کا بچہ (۱+۲+۳)، ۱ سال، (۴+۵) ۱ سال، (۶+۷)، ۱ سال، ۱۲ سال کی عمر میں جماعت ۸

(۷) ۱۰ سال کا بچہ (۱ تا ۴) ۱ سال، (۵+۶)، ۱ سال، (۷+۸)، ۱ سال، ۱۳ سال کی عمر میں جماعت ۹

(۸) ۱۱ سال کا بچہ (۱ تا ۵) ۱ سال، (۶+۷) ۱، سال، (۸+۹) ۱ سال ۱۴ سال کی عمر میں جماعت ۱۰

(۹) ۱۲ سال کا بچہ (۱ تا ۶) ۱ سال، (۷+۹)، ۱ سال، ۱۴ سال کی عمر میں جماعت ۱۰

(۱۳) ۱۳ سال کا بچہ (۱ تا ۸) ۱ سال، (۹+۱۰) ۱ سال، ۱۵ سال کی عمر میں جماعت ۱۱

اسی طرح ۱۴ تا ۱۷ سال کے بچے دو، دو سال خصوصی تعلیم کے بعد ۱۱ ویں جماعت میں داخل ہوں گے۔ ۱۸ سال کے بعد یہ ان کی صوابدید ہے کہ ملازمت کریں اور بعد دوپہر جماعت میں باقی تعلیم مکمل کر لیں یا دن کو جاری رکھیں۔ ضروری نہیں کہ ان بچوں کو دو، دو ماہ کی چھٹیاں دی جائیں۔

اس طرح ۴ سے ۱۸ سال کے بچے پہلے ہی سال باقاعدہ یا خصوصی نصاب میں داخلہ کے ذریعے باقاعدہ تعلیمی نظام میں شامل ہو جائیں گے۔

۱۹ سے ۵۰ سال تک کے اصحاب بعد دوپہر ۱۰ سال کا تعلیمی نصاب مکمل کریں گے۔

(۱) ان کا تعلیمی مرکز ان کے گھروں کے قریب ہوگا۔

(۲) ان کے نصاب میں کسی ایک ہنر کی اعلیٰ تعلیم اور عملی مشق شامل ہوگی۔

(۳) روزانہ تعلیم کا دورانیہ ۳ گھنٹے ہوگا۔

(۴) ان میں سے جو ہر قابل کے لیے اپنے تعلیمی نتائج کی بنیاد پر بعد دوپہر مدارس میں ۱۱ ویں جماعت میں داخلہ لے کر اپنی صلاحیت کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع موجود ہوں گے۔

(۵) ضروری نہیں کہ انہیں سال میں دو ماہ کی چھٹیاں دی جائیں۔

۵۰ سال سے بڑے تمام اصحاب بعد دوپہر ۵ سالہ تعلیمی نصاب مکمل کریں گے۔

ان میں سے بھی جو ہر قابل کے لیے ان کی اپنی صوابدید پر مزید تعلیم کے مواقع موجود ہوں گے۔

۵۔ بچوں سے فیس ان کے والدین کی آمدنی کے مطابق لی جائے گی۔ والدین کی ایک مقررہ حد سے کم آمدنی والے بچے بغیر فیس کے تعلیم حاصل کریں گے۔

قلیل آمدنی والے یا بے روزگار والدین کے بچوں کے لیے مناسب وظائف کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

ہر بچے کو جو رسید جاری کی جائے گی اس پر لکھا ہوگا 'واجبات ادا کر دیئے گئے'۔

## کمرۂ جماعت میں

(۱) بچوں کے فیس دینے یا نہ دینے کا کوئی ذکر نہ ہوگا۔

(۲) والدین یا خاندان کی حیثیت کا بھی کوئی ذکر نہ ہوگا۔

(۳) تمام بچے مدرسہ بسوں میں آئیں گے۔

(۴) تمام بچے ایک ہی قسم کے کپڑے کے لباس میں ملبوس ہوں گے۔

(۵) جماعت میں وجۂ امتیاز صرف اور صرف قابلیت ہوگی۔

(٦) بچوں کے والدین کی حیثیت کے بارے میں معلومات صرف صدر مدرس کے پاس ہوں گی، کسی استاد کے لیے یہ معلومات حاصل کرنا یا اگر معلوم ہوں تو ان کے مطابق کسی قسم کا امتیازی رویہ اختیار کرنا غیر قانونی ہوگا۔

ہر امتحان کے بعد بچوں کی درجہ بندی، حاصل شدہ نتائج کے مطابق ہوگی۔ اعلیٰ صلاحیت، درمیانی صلاحیت اور کمزور صلاحیت۔ کمزور صلاحیت کے بچوں کے لیے اوقاتِ مدرسہ کے بعد خصوصی تعلیم کا انتظام ہوگا۔

(٦) سال کے بعد ہر بچے کو اگلی جماعت میں بھیج دیا جائے گا۔ کمزور صلاحیت کے بچوں پر خصوصی توجہ حسبِ سابق برقرار رکھی جائے گی۔

۱۱ سال کی یکساں تعلیم وتربیت کے بعد آخری دو سالوں میں علمی شعبوں کی تخصیص کر دی جائے گی (طبعی، ہندسی، معاشی وغیرہ)۔ کمزور صلاحیت کے طلباء کو مختلف پیشوں کی علمی وعملی تربیت دی جائے گی۔ معاشرتی علوم سب کے لیے حسبِ سابق یکساں ہوں گی۔

(۷) اصل توجہ تین زبانوں پر مرکوز رہے گی، مادری، اردو اور عربی۔ ایک اور (چوتھی) زبان کا اختیار ہر طالب علم کو حاصل رہے گا۔

اردو رابطے اور علم کی زبان ہوگی۔ عربی ہماری ثقافتی زبان ہے، قرآن وحدیث براہ راست عربی زبان میں پڑھائے جائیں گے۔

(۸) چودہ سال کی لازمی تعلیم صرف سرکاری شعبہ میں ہوگی۔ نجی شعبہ اس میں قطعاً حصہ نہ لے سکے گا۔

نجی شعبہ اعلیٰ تعلیم اور تحقیقی شعبہ جات میں اپنا کردار ادا کرے گا۔ طبعی، ہندسی، معاشی، تعلیمی اداروں اور اعلیٰ طبعی علوم کے لیے جامعات میں طلباء کے لیے تحقیق کے مواقع مہیا کیے جائیں جو تخلیقی صلاحیت اجاگر کرنے میں معاون ہو سکیں۔

(۹) با قاعدہ تعلیم کی طرح خصوصی نصابات میں بھی طلباء کو معیار پر پورا نہ اترنے کے باوجود اگلی جماعتوں میں بھیج دیا جائے گا۔

جہاں تک معیار کا معاملہ ہے تمام بچے پیدائشی طور پر ذہنی صلاحیتوں میں برابر نہیں ہوتے۔ آپ ایک پست ذہنی صلاحیت کے بچہ کو ایک حد سے اوپر نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ اثر اس صورت میں اور بھی گہرا

ہوجاتا ہے جب بچہ کے باپ دادا میں تعلیم کی کوئی روایت نہ رہی ہو۔ استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر عمومی طور پر ایسے بچوں کو تعلیم دینا ایک کٹھن مرحلہ ہے لیکن انہیں ان پڑھ چھوڑ دینا خود ان کے لیے اور مجموعی تعلیمی صورتِ حال کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں (خصوصی توجہ کے ساتھ) پورے تعلیمی نظام سے گزار دیا جائے۔ ساتھ ہی انہیں کسی نہ کسی پیشہ کے لیے تیار کر دیا جائے۔ اس طرح امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ چند نسلوں میں یہ اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کے قابل ہوسکیں گے۔

یہ ساری کاوش صرف پہلی بار کے لیے ہوگی۔ ایک بار ہمت سے ارادہ کرلیا جائے تو سو فیصد تعلیم کا ہدف (جو کچھ بھی معیار ممکن ہے، اس کے مطابق) حاصل ہوسکے گا۔ آئندہ صرف باقاعدہ تعلیمی نظام رہ جائے گا۔ مسلسل کوشش سے معیار کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔

تعلیمی نظام کو بتدریج درست کرنے اور وسعت دینے کا نظریہ غلط، ناقابل عمل اور ہمارے گزشتہ تجربے کے خلاف ہے۔ آزادی کے بعد ہم نے اجتماعی معاملات میں بالغ نظری کا ثبوت نہیں دیا۔ سیاسی معاملات ہوں، تعلیمی یا معاشی معاملات، ہر جگہ ''وقت گزاری'' کی گئی۔ ہم حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی بجائے آنکھیں چرا کر ادھر اُدھر نکلتے رہے جس کی وجہ سے حالات نے ہمیں گھیر کر نڈھال کر دیا۔ اب صورت یہ ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!

ایک قابل عمل سچی راہ ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ اپنی ذات پر بھروسہ کرنا، اپنی صلاحیتوں کی دریافت اور اپنے پاؤں پر چلنا خواہ پاؤں کتنے بھی زخمی ہوں۔

پہلا قدم جو ہم اُٹھائیں گے وہ حصولِ تعلیم کا ہوگا۔ ہر پاکستانی فرد تعلیم یافتہ ہو، اپنے ماضی اور اپنے حال کو جانتا ہو اور مستقبل کی جانب اعتماد سے نظر اُٹھانے کے قابل ہو۔ وہ صرف علم حاصل ہی نہ کرے علم تخلیق بھی کرے۔ دنیا سے محض لے ہی نہ، دینے کے قابل بھی ہو۔

اس کے لیے کام ہنگامی بنیادوں پر کرنا ہے۔ پہلے ایک نظام بنانا ہے اور پوری قوم کو اس میں سے گزار کر تعلیم سے ہمکنار کر دینا ہے اور پھر ایک منظم معاشرے کی قوت کے ساتھ حالات کی باگ اپنے ہاتھ میں لینی ہے۔

(۱۰) حصولِ تعلیم کے لیے عمر کی قید ختم کر دی جائے گی، تعلیم کسی معاشی، سیاسی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ایک بنیادی حق کے طور پر حاصل کی جائے گی۔ کوئی بھی شخص کسی بھی عمر میں جب چاہے اپنے گزشتہ تعلیمی نتائج کو بہتر کرنے کے لیے یا آگے تعلیم حاصل کرنے کے لیے تعلیمی اداروں میں داخل ہوکر یا قواعد کے مطابق اپنے طور پر امتحانات میں حصہ لے سکتا ہے۔

کوئی شخص وسائل کی کمی کی وجہ سے تعلیم سے محروم نہیں رہ سکے گا۔حکومت (یا نجی اداروں) کے پاس قرضے مہیا کرنے کے لیے قواعد اور ضمانتوں کا ایک نظم ہوگا جس کے تحت تکمیل تعلیم اور حصولِ ملازمت کے بعد یہ قرضہ جات واپس کیے جا سکیں گے۔

(۱۱) تعلیمی سال یکم جنوری سے ۳۱ دسمبر کر دیا جائے گا۔

داخلوں، امتحانوں اور نتائج کے اعلانات کی تاریخیں مقرر کر دی جائیں گی۔

(۱۲) دارالترجمہ: بجائے اس کے کہ ایک انگریزی کتاب پڑھنے کے لیے پوری قوم انگریزی زبان پڑھے، انگریزی کتاب کو اردو زبان میں منتقل کر دیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے ایک مرکزی دارالترجمہ قائم کرنے کی ضرورت ہے جہاں:

۱۔ ہر شعبۂ تعلیم کے ماہرین ہونے چاہئیں جو ترجمہ کرنے میں مہارت رکھتے ہوں۔

۲۔ ہر شعبۂ علم کی نمائندہ کتب کا ترجمہ کر دینا چاہیے۔

۳۔ ہر نئی چھپنے والی قابل لحاظ تحقیقی، ادبی، تاریخی (وغیرہ) کتاب کا ترجمہ ہو جانا چاہیے۔

۴۔ دارالترجمہ سے منسلک ایک ذخیرۂ کتب ہونا چاہیے جس میں دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں چھپنے والی کتب موجود ہوں۔ اس کی شاخیں تمام بڑے شہروں میں ہوں اور آپس میں مربوط ہوں۔

۵۔ دارالترجمہ سے منسلک ایک چھاپہ خانہ بھی ہو جو ہر قسم کی جدید سہولیات سے آراستہ ہو۔

۶۔ دارالترجمہ ہی سے منسلک ایک ادارۂ زبان دانی ہونا چاہیے جہاں دنیا کی بڑی زبانیں سیکھی جا سکیں۔ زبان سیکھنے کی جدید سہولیات موجود ہوں۔ ہر شعبہ کو اہلِ زبان کی نگرانی میں ہونا چاہیے۔

اس ادارہ کی شاخیں تمام بڑے شہروں میں ہوں اور باہم مربوط بھی ہوں۔

(۱۳) جمعیت برائے تیاری نصاب و تفحیص نتائج

(۱) یہ جمعیت طلباء کے لیے مقاصد تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے تمام مراحل کے نصابات تیار کرنے کی ذمہ دار ہوگی۔

جمعیت کے پاس ایک مستقل نظام کار ہوگا جس کے ذریعہ وہ جانچ کرے گی کہ:

۱۔ علم کو محض رٹا گیا ہے یا سمجھا بھی گیا ہے۔

۲۔ کیا علم کی مطلوبہ سطح تک پہنچا جا سکتا ہے؟

۳۔ کیا علم کو تجربہ میں لانے کی صلاحیت اجاگر ہوئی؟

۴۔ مقاصد تعلیم کے لحاظ سے طلباء کا معیار کیا ہے؟

جمعیت تفحیص ونظر ثانی کے عمل کو مسلسل جاری رکھے گی اور نصاب میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ طریقِ تعلیم وغیرہ کے بارے میں اپنی تجاویز اوران پر عمل درآمد پر نظر رکھے گی۔

(ب) اساتذہ کے لیے مرحلہ وار تعلیمی معیار مقرر کرنا اوران کی تعلیم وتربیت کا ایسا نظام وضع کرنا جس سے اساتذہ میں علم کو طلباء تک منتقل کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت پیدا ہو سکے۔

طلباء سے استادانہ دھونس کے بجائے اخلاقی وعلمی برتری سے متاثر کرنے کے لیے مناسب رہنمائی فراہم کرنا۔

## پیسہ کہاں سے آئے گا؟

(ا) جہاں تک جاری اخراجات کا تعلق ہے، اگر ۱.۸ فیصد تخمینہ سے ۵۰ فیصد سے زائد طلباء تعلیم حاصل کر سکتے ہیں تو ۴ یا ۵ فیصد سے ۱۰۰ فیصد طلبا کے اخراجات پورے کیے جا سکتے ہیں۔ اگر ہمیں دنیا میں عزت سے رہنا ہے تو ہمارے تعلیمی اخراجات کا اندازہ ۱۰ فیصد ہونا چاہیے۔

(۲) اصل مسئلہ وہ خرچہ ہے جو مدرسوں کی عمارات اور سامان وغیرہ پر اٹھے گا، یہ خرچہ ۵۰۰ ارب روپیہ تک ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اتنا مشکل نہیں کہ ہم اسے برداشت نہ کر سکیں۔ اگر ایک صوبہ گیارہ ماہ میں ایک سڑک کی تعمیر کے لیے ۱۳۰ ارب روپیہ نکال سکتا ہے یا مرکز ۴۸۰ ارب روپیہ کا گردشی قرضہ یکمشت ادا کر سکتا ہے تو ایک سال کے لیے ۵۰۰ ارب روپیہ نکالنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ خرچہ ایک ہی بار ہونا ہے اور مسئلہ یہاں بھی صرف سیاسی ارادہ کا ہے۔ اگر ایک (یا زیادہ سے زیادہ دو) سال کے لیے سڑکیں اوراس طرز کے ترقیاتی اخراجات کو روک دیا جائے تو یہ کام آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اس کی ترتیب کچھ یوں ہو سکتی ہے:

(ا) ایک سال کے لیے کل ترقیاتی تخمینہ مدرسوں کی عمارات کی تعمیر اور سامان کے لیے مختص کر دیا جائے۔

(ب) ملک میں ایک سال کے لیے عمارات کی تعمیر ممنوع قرار دے دی جائے تا کہ سارا سامانِ تعمیر مدارس کی عمارات کے لیے حاصل ہو سکے۔

(ج) منصوبہ بندی: یہ معلوم کیا جائے کہ:

(۱) کل ان پڑھ بچوں کی تعداد کتنی ہے؟

(۲) جغرافیائی طور پر وہ کہاں کہاں کس تعداد میں موجود ہیں؟

(۳) مدرسہ جات کہاں کہاں بنائے جائیں گے اور یہ کہ کسی بھی جگہ مدرسہ کا حجم کیا ہوگا۔ جس کا تعلق وہاں پر طلباء کی تعداد سے ہوگا۔

(۴) تمام چھوٹے بڑے مدارس کے معیاری نقشہ جات تیار کر لیے جائیں، جہاں بھی جس حجم کا مدرسہ بنے گا، انہی نقشوں کے مطابق بنے گا۔

(۵) تمام مدارس کی ضروریات کو یکجا کر لیا جائے گا۔ کل سیمنٹ کی مقدار کے بارے میں تمام سیمنٹ پیداواری اداروں کو آگاہ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح سریا بنانے والوں کو مانگ کا پہلے سے پتہ ہوگا اور وہ اسے مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسی صورت میں دروازے، الماریاں، بینچ اور دیگر سامان بنوالیا جائے گا۔

یہ کام مکانات بنانے والے ٹھیکیداروں اور مزدوروں سے لیا جائے گا۔ کسی بھی تعلیمی نظام کی ابتدا کے لیے جس میں ہماری ملی ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہو اور اس میں سو فیصد شہریوں کو شامل کرنا مقصود ہو، مندرجہ ذیل مشکلات درپیش ہوں گی:

(۱) حاجت مند والدین ہرگز یہ پسند نہ کریں گے کہ ان کے بچے جو کچھ کما کر ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں وہ محض تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا بند کر دیں۔ بعض بہت غریب لوگوں کے لیے ایسا کرنا واقعی مشکل بھی ہوسکتا ہے۔ حکومت کے پاس غرباء کو نقد ادائیگیوں کا نظام موجود ہے، اس میں ان مستحق گھرانوں کی امداد کا بندوبست کیا جانا چاہیے۔

(۲) وہ خاندان جن کے ہاں یہ بچے کام کرتے ہیں وہ نہیں چاہیں گے کہ ان بچوں کو فارغ کر کے ان سے حاصل ہونے والی سہولتوں سے دست بردار ہو جائیں۔

اس کے علاوہ گھروں میں نوکروں سے کام لینا ہماری تہذیب کا حصہ بن گیا ہے۔ ہر کوئی نوکروں کی تعداد کو ذریعہ فخر سمجھے ہوئے ہے، خواتین گھر کے کام کو عار سمجھتی ہیں، وہ انہی بچے بچیوں سے کام لیتی ہیں۔

تعلیم کو آگے بڑھانے کے لیے ایک بنی بنائی تہذیبی روش کو ختم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، جس پر کام کرنے اور کام لینے والوں دونوں متفق اور مطمئن ہیں، یہ کوئی آسان کام نہیں ہوا کرتا، اس کے اب تک نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ کوئی اسے کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

ظاہر ہے کہ تعلیم لازمی ہونے کی صورت میں یہ بچے ملازمت کے لیے دستیاب نہ ہوں گے۔

(۳) مقتدر اور سرمایہ دار طبقہ نجی اور انگریزی سکولوں کی سہولیات سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

ہمارے ہاں ے انگریزی میں اہلیت ایک ایسا زینہ بن گیا ہے جو اقتدار کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اخراجات کر کے اپنے بچوں کو ''انگریزی سکولوں'' میں پڑھانا پسند کرتے ہیں۔

(۴) ہمارا معاشرہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے گذر رہا ہے، انحطاط کی زد میں آیا ہوا ہر معاشرہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک ''لبرل'' طبقہ سرمایہ دار بھی ہے، مقتدر بھی ہے اور اسے بیرونی (خصوصاً افرنگی) امداد و ہلاشیری بھی حاصل ہے۔ ملک میں افواج اور عدالتی، تعلیمی اور معاشی نظام انہی کے اقتدار میں ہیں۔

یہ طبقہ پرانی روایات کی بے توقیری، طبعی علوم کی کارسازی اور نسوانی بے حجابی کا دلدادہ ہے۔ ان کے مقابلہ میں جو پرانی روایات کا حامل طبقہ ہے وہ اصحاب فقہی/مسلکی بحثوں میں مشغول رہتے ہیں، عبادات کو کامیابی کا زینہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی طرز کے اداروں کو خوش اسلوبی سے چلاتے ہیں۔ ان کا نظام تعلیم بھی علیحدہ ہے۔ جسے ''دنیاوی'' تعلیم سے الگ رکھا گیا ہے۔

ان دونوں طبقات میں معتدل اور متشدد رویے موجود ہیں، کئی مقامات پر باہم متزاحم بھی ہیں۔ یہی رویے یکساں تعلیمی نظام کی راہ میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں۔

یہ وہ مسائل ہیں جو قانون سے حاصل نہیں ہوسکتے، ہوسکتے بھی ہوں تو قانون کی قوت انہیں حل کرنے کے لیے موجود نہیں!

یکساں لازمی تعلیم کا انتظام چونکہ عوام/سرکاری شعبہ ہی میں ممکن ہے، سیاستدانوں کی آمادگی کے بغیر یہ ممکن نہیں، یہ اصحاب کوئی بھی کام کرنے کے لیے رائے عامہ کے دباؤ کے علاوہ کسی اور دلیل سے راضی نہیں ہوتے۔

یہ مسئلہ عوام کے پاس جانے سے حل ہوگا، انہیں بتانا ہوگا کہ جہالت سے نکلے بغیر وہ نہ اپنے حقوق کا تعین کرسکتے ہیں اور نہ انہیں حاصل کرسکتے ہیں۔ جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے اور نئے حقائق پیدا نہیں کرتے، حالات کو نہیں بدلا جاسکتا۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے، نتائج کا تعلق اس سے ہوگا کہ عوامی بیداری کی اس تحریک کو

کون لوگ چلا رہے ہیں۔ اگر اس تحریک کو کسی بھی سطح پر پرانے کھلاڑی اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں تو ہوسکتا ہے حصولِ تعلیم کے مواقع میں کچھ بہتری آ جائے یا عوام کی محرومیوں میں کچھ کمی ہو جائے لیکن عمومی حالات میں کوئی جوہری فرق نظر نہ آئے گا۔

ہمیں ایک ایسی فضا بنانا ہوگی جس میں یہ مسائل بغیر اختلافات کو ہوا دیئے آسانی سے طے ہوسکیں، عوامی رہنمائی کے لیے طبقاتی احساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے اعتدال کی راہ تلاش کرنا ہوگی جس پر اختلافات اور بعض اوقات متضاد خیالات کو برانگیختہ کیے بغیر آگے بڑھا جاسکے، مسلسل محنت اور لگن سے مختلف طبقات کو یہ باور کرانا لازمی ہے کہ موجودہ حالات سے نکلنے کے لیے عوامی بیداری کے ذریعہ سو فیصد تعلیم کے حصول اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے سوا آگے بڑھنے کا کوئی متبادل موجود نہیں۔ بے غرضی اور ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے تکرار اور خلفشار کی اس فضا میں محبت واخوت کا پیغام دیا جانا چاہیے۔

اگر ایک گروہ تن مَن دھن کی پرواہ کیے بغیر میدانِ عمل میں نکل آئے تو کوئی وجہ نہیں کہ بہت جلد عوامی توجہ حاصل کر کے مطلوبہ مقاصد کی طرف بڑھا نہ جاسکے۔ اگر خلوص نیت اور للّٰہیت کو برقرار رکھا جائے، مخالفت پر ردّ عمل کے بجائے مثبت جذباتِ یگانگت کا اظہار کیا جائے، فساد کے مقابلہ کے لیے صبر اور برداشت کو ڈھال بنالیا جائے تو بس، اجتماعی سدھار کی یہی راہ ہے، جس کے ذریعہ مثبت نائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اس کے لیے ہمیں چاہیے:

i- تمام سیاسی، مذہبی وسماجی جماعتوں کے ساتھ گفتگو، ان کے کارکنوں کا تعاون حاصل کرنا اور ان کی قیادتوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنا۔

ii- رائے عامہ کو متاثر کرنے والے تمام ابلاغی ذرائع سے تعاون حاصل کرنا اور ان کے ذریعہ لوگوں تک بات پہنچانے کی کوشش کرنا۔

iii- اجتماعات، چھوٹے: محلوں میں لوگوں کو جمع کرنا اور اپنی بات کہنا

بڑے: قصبوں، شہروں کے مرکزی مقامات پر جمع ہونا اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے حضرات کو وہاں لانے کی کوشش کرنا۔

iv- مظاہرے: خاموش: جیسے ایک کتبہ اُٹھا کر کسی مصروف اور پُرہجوم بازار میں سے گزر جانا۔

صوتی: چند حضرات کا کتبے کے ساتھ مکبر الصوت پر اپنی بات کہتے ہوئے گزر جانا۔

v- اخبارات میں مضامین چھپوانا، مدیران سے گفتگو کر کے ان سے حمایت میں لکھوانا۔

vi- طلباء تنظیموں کے ذریعہ طلباء کو عوامی رابطے کے لیے تیار کرنا۔

vii- مدارس کے اساتذہ تک رسائی۔

viii- مقتدر سیاستدانوں (اسمبلیوں، پارلیمنٹ، سینیٹ کے ارکان وغیرہ) سے مسلسل رابطے اور انہیں تعلیمی ترقی کی طرف راغب کرنا۔

ix- کاروباری تنظیموں کے ذریعہ کاروباری طبقہ تک رسائی۔

x- اشتہارات اور کتابچوں کی وسیع اشاعت

اور مزید بھی جو کچھ ہو سکتا ہے۔

اگر ایک بار معاشرہ کسی بھی سطح پر منظم ہو جائے اور مناسب رہنمائی کی کوئی صورت بن جائے تو اس سے جو تحرکِ حاصل ہو گا اسے حکمت سے استعمال کر کے دوسرے مسائل کو حل کرنے کی طرف بھی بڑھایا جا سکتا ہے۔

اس زمانہ میں ہمارے بڑے بڑے مسائل یہ ہیں:

۱۔ مقصدِ حیات انسانیت اور بھائی چارہ ہو، معاش نہ ہو۔

۲۔ تعلقات کی بنیاد انصاف ہو، ظلم نہ ہو۔

۳۔ کسی بھی سطح پر بدعنوانی اور بے حیائی نہ ہو۔

۴۔ تمام درست وسائل کو بروئے کار لا کر بہتر اور خوش حال زندگی کی تعمیر ہو۔

........................

## البرہان:

ہم نے یہ مضمون موصول ہونے پر مصنف کو لکھا کہ:

☆ آپ کا منصوبہ حکومت کے لیے ہے اور حکومتوں کا حال آپ کو معلوم ہے۔ حکومت کو اس کا قائل، اس پہ مائل اور اس کے نفاذ پر مجبور کرنے کے لیے بھی کوئی لائحہ عمل ہونا چاہیے۔

☆ اگر حکومت اس پر عمل نہ کرے تو پرائیویٹ سیکٹر کے لیے آپ کوئی کردار کیوں تجویز نہیں

کرتے؟ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ پھر ماضی میں نظام تعلیم مسلم معاشرے کے ہاتھ میں تھا نہ کہ ریاست وحکومت کے،تو اب یہ کیوں ناممکن ہے؟

☆ آپ اپنے مضمون میں ہر جگہ یہ اسلوب استعمال کرتے ہیں کہ ''یہ کریں گے'' وہ کریں گے، یہ قدم اُٹھائیں گے جب کہ تجویز کا اسلوب ہونا چاہیے کہ یہ کیا جائے یا یہ کرنا چاہیے۔

☆ اگر چہ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ آپ تعلیم کی مغربیت (Westernization) کی حمایت نہیں کرتے اور اس کے مقامی کردار ومزاج کے حامی ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک دفعہ بھی اسلام اور نظریۂ پاکستان کے الفاظ استعمال نہیں کیے حالانکہ ملک اسی کے نام پر وجود میں آیا۔ آئین اس کی حمایت کرتا ہے اور آج تک جتنے قوانین اور قومی تعلیمی پالیسیاں بنی ہیں وہ اس کی توثیق کرتی ہیں!

## افتخار الدین منصور:

(مصنف نے ہمارے خط کے جواب میں لکھا کہ)

(۱) سلطنت کے لیے معاشرہ کے اپنے تنظیمی ڈھانچہ کی وحدت کی بجائے حاکم ومحکوم کی ثنویت کی روایت پر عرب بادشاہت استوار ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زبردست اخلاقی اثر کی وجہ سے لوگوں نے اپنی ترتیب علیحدہ رکھی جو مرورِ زمانہ سے محکوم ہی بنے۔عوام اگر حق خود ارادیت کے قابل ہوں تو وحدت بنتی ہے نہ ہوں تو ثنویت!علم وکردار کی رہنمائی میں افرادِ معاشرہ کی تعلیم وتربیت سے عوامی حق خود ارادیت کی تعمیر ہی معاشرتی وحدت پیدا کرسکتی ہے۔

یوں بھی اگر لازمی تعلیم نجی شعبہ کے سپرد کی جائے تو وہی ہوگا جو اب تک ہورہا ہے، وہ تو گویا موجود کو دوام بخشا ہوا،طبقاتی تقسیم بھی وہی رہے گی،آگے بڑھنے کی رفتار بھی وہی!

(۲) اس تجویز کے تحت یوں ہوگا، یا اسے یوں ہونا چاہیے،قریب المفہوم ہیں،گوسارے مفاہیم صد فیصد ہم معنی نہیں ہوتے۔ یہ اسلوب ارادتاً اختیار نہیں کیا گیا۔

(۳) معروف اصطلاحات ارادتاً استعمال نہ کرنے کی وجہ (جیسا کہ متن میں بھی عرض کیا گیا ہے) یہ ہے کہ تمام طبقات (خصوصاً لبرل طبقہ) کو ساتھ رکھا جاسکے۔نتائج کا تعلق اس حقیقت سے ہوگا کہ عوامی بیداری کے لیے رہنمائی کن لوگوں کے ہاتھ میں ہے!

فقہ و قانون ڈاکٹر محمد امین

# مسلم ممالک کے باشندوں کے لیے
# بلاد کفار کی شہریت غیر شرعی ہے

کچھ عرصہ پیشتر جب ملک میں اہم سرکاری مناصب پر پاکستان کے علاوہ غیر مسلم ممالک کی شہریت قبول کرنے کا معاملہ زیر بحث تھا تو ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ کے مدیر اور تنظیم اسلامی کے رہنما جناب انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب نے ایک استفتاء ملی مجلس شرعی کے علماء کے پاس بھیجا کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت قبول کرتے وقت جو حلف اُٹھایا جاتا ہے، وہ نقیض اسلام ہے یا نہیں؟ بوجوہ یہ معاملہ ملی مجلس شرعی کے علماء کرام کے ہاں تو اب تک زیر غور نہیں آ سکا البتہ ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی طالب علمانہ جسارت کی ہے تاکہ علماء کرام جب اس موضوع پر غور فرمائیں تو یہ نقطۂ نگاہ بھی ان کے سامنے رہے۔ مدیر

## سوال کی نوعیت

اگرچہ مستفتی نے صرف اتنا سوال پوچھا ہے کہ غیر مسلم ممالک کی شہریت کے لیے جو حلف اٹھانا پڑتا ہے وہ خلاف شریعت ہے یا نہیں لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سوال سے جڑا ہوا دوسرا سوال یہ ہے کہ کسی غیر مسلم ملک میں جا کر رہائش اختیار کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا مطلب اور مقصد یہی ہے کہ ایک مسلمان وہاں جا کر رہے۔ بلکہ مناسب ہوگا کہ اس دوسرے سوال کا پہلے جواب دے دیا جائے کیونکہ اگر کسی غیر مسلم معاشرے میں رہنے کا شرعی جواز ثابت نہ ہو سکے تو لامحالہ ایسے ملک کی شہریت اختیار کرنے اور اس کے لیے حلف اٹھانے کا جواز بھی کمزور ہو جائے گا لہذا پہلے ہم اس بات پر غور کریں گے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور پھر اس بات کی طرف آئیں گے کہ اس مقصد سے کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا اور اس کے لیے ایسا حلف اٹھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے جس میں کافرانہ قوانین کی اطاعت اور کافر ریاست کی حفاظت کی خاطر جان دینے کا عہد کرنا پڑے۔ واللہ المستعان

## غیر مسلموں کے ساتھ معاشرت اختیار کرنا

اس ضمن میں قرآن وسنت سے، جو ہمارے دین کا بنیادی ماخذ ہیں، ہمیں بعض بنیادی اصولوں کا

پتہ چلتا ہے جو یہ ہیں:

## ۱۔ الگ مسلم تشخص

مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا (یعنی بحیثیت ملت، قوم، معاشرہ اور ریاست) ایک مستقل اور الگ تشخص اور پہچان (identity) ہونی چاہیے تا کہ وہ غیر مسلموں ☆ سے ممتاز اور منفرد نظر آئیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی وضع قطع غیر مسلموں سے مختلف ہونی چاہیے اور فرمایا کہ ''داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ''(۱) کیونکہ اس زمانے میں غیر مسلم داڑھی کٹواتے اور مونچھیں بڑھاتے تھے۔ اسی طرح وضع قطع میں غیر مسلموں کی سی مشابہت اختیار کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ 'جو اِن کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے''(۲) اور اجتماعی زندگی میں غیر مسلموں کے تہواروں کو ترک کر کے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے دو تہوار مقرر کرنا(۳) اور ان کے ۹ محرم کے روزے کے مقابلے میں ۹ اور ۱۰ دو دن کا روزہ رکھنے کا اعلان کرنا(۴) اور اللہ تعالی کا مسجد اقصیٰ کی بجائے مسجد حرام کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر کرنا(۵) وغیرہ شامل ہیں۔

مسلمانوں کی الگ پہچان اور منفرد تشخص کے حوالے سے شریعت یہ اصول بھی وضع کرتی ہے کہ غیر مسلموں کی مخالفت کی جائے چنانچہ بہت سارے معاملات میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''**خالفوا المشرکین والیھود۔۔۔**''(۶)۔ یہ سپرٹ ہمیں قرآن وسنت میں ہر کہیں نظر آتی ہے مثلاً مناسک حج کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ طواف وقار سے کرو اور کفار کی طرح سیٹیاں نہ بجاؤ اور سب لوگوں کی طرح عرفات تک جاؤ اور وہاں قیام کرو اور اس سے پہلے ہی واپس نہ لوٹ آؤ اور کفار کے ذکر آباو اجداد کی بجائے اللہ کو کثرت سے یاد کرو،(۷) حرام مہینوں کا ادل بدل نہ کرو،(۸) لڑکیوں کو زندہ دفن نہ کرو،(۹) مرحوم باپ کی بیویوں سے شادی نہ کرو(۱۰)۔۔۔اور بنی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہود و نصاری داڑھی کٹواتے اور مونچھیں بڑھاتے ہیں تم اس کے برعکس کرو۔ وہ سر اور داڑھی کے بالوں کو نہیں رنگتے تم رنگو(۱۱)۔ وہ حیض کے دنوں میں بیویوں کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں تم نہ چھوڑو(۱۲) وغیرہ۔

---

* غیر مسلموں کا لفظ ان سب افراد، قوموں اور ملتوں کو محیط ہے جو اس حق کا انکار کریں جو حضرت محمد ﷺ لے کر مبعوث ہوئے تھے خواہ وہ خدا، رسول، آخرت اور انبیاء وکتب آسمانی کو نہ ماننے والے مشرک، کافر اور بت پرست ہوں یا سابقہ منحرف ادیان کو ماننے والے یہود ونصاری ہوں جن کا تصور توحید ورسالت بگڑ چکا ہے اور وہ حضرت محمد ﷺ کو نبی نہیں مانتے، اگرچہ ثانی الذکر کے لیے بعض (مشروط) مراعات سنت سے ثابت ہیں جیسے ان کا ذبیحہ کھانا (اگر وہ اس پر اللہ کا نام لیں) اور ان کی عورتوں سے شادی کرنا (بشرطیکہ وہ محصنہ ہوں) وغیرہ۔

## ۲۔ کفار کی اسلام و مسلم دشمنی

قرآن علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ کفار اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان سے 'ولاء' اور دوستی کا تعلق نہ رکھیں:

### - یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ □ [المائدہ5:51]

''اے ایمان والو یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ''

- وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں تمہارے نہیں

بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ □ [المائدہ5:51]

''وہ (صرف) ایک دوسرے کے دوست ہیں''

- جو اِن سے دوستی کرے وہ انہی میں سے ہے

وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ □ [المائدہ5:51]

''تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا''

- جو اِن سے دوستی کرے وہ ظالم ہے اور ہدایت الٰہی سے محروم ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ [المائدہ5:51]

''بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''

نوٹ: چھٹی صدی ہجری کے عظیم اندلسی عالم، فقیہ، محدث اور سیرت کی معروف کتاب ''الشفاء'' کے مؤلف قاضی ابن عیاضؒ نے اپنی کتاب ''مصباح الارواح فی اصول الفلاح'' میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ان مسلمانوں کی تکفیر کی ہے جو یہودیوں کے ساتھ دوستی کا تعلق رکھیں اور ان کی حمایت کریں (۱۳)۔

- یہودی اور مشرک عیسائیوں سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے دشمن ہیں

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَھُوْدَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا

[المائدہ5:82]

''ایمان والوں کے ساتھ دشمنی میں تم سب سے بڑھ کر یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے''

- اہل کتاب اور کفار اسلام دشمن ہیں ان سے دوستی کرو

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا

**الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** [المائدہ 57:5]

’’اے ایمان والو! اہل کتاب اور کافروں میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم واقعی ایمان والے ہو‘‘۔

- ان کو راز دار نہ بناؤ

**يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ** [آل عمران 118:3]

اے ایمان والو! غیر مسلموں کو (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو، کیونکہ سابقہ آیات میں انہی کا ذکر ہے) اپنا راز دار نہ بناؤ۔‘‘

- یہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں

**لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا** [آل عمران 118:3]

’’وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔‘‘

- یہ تمہارے بدخواہ ہیں

**وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ** [118:3]

’’وہ چاہتے ہیں کہ تم مشکل میں پڑو۔‘‘

- ان کی مسلم دشمنی ان کے ظاہر سے بھی نمایاں ہے

**قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ** [آل عمران 118:3]

’’ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے۔‘‘

- اور ان کے دلوں میں تو تمہارے خلاف زہر بھرا ہوا ہے

**وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ** [118:3]

’’اور جو بغض ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔‘‘

- وہ تمہارے دوست نہیں ہیں

**هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ** [119:3]

’’تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔‘‘

- وہ تمہارے خلاف غصے، نفرت اور انتقام سے بھرے بیٹھے ہیں

**وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ** [119:3]

’’جب وہ تم سے الگ ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔‘‘

- تمہاری خوشی اور خوشحالی سے ان کو تکلیف ہوتی ہے

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ [آل عمران 120:3]

’’اگر تمہارے حالات اچھے ہوں تو انہیں رنج ہوتا ہے۔‘‘

- اور تمہاری تکلیف سے وہ خوش ہوتے ہیں

وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا [آل عمران 120:3]

’’اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔‘‘

- یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں کہ تم بے دین ہو جاؤ اور ان کی پیروی کرو

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ [120:2]

’’یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب اختیار نہ کر لو۔‘‘

- یہود و نصاریٰ کی پیروی اللہ کی ناراضی کا سبب ہے

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ [120:2]

’’اور اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آ جانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہو گا اور نہ کوئی مددگار۔‘‘

- کفار سے دوستی نہ کرو

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا۔ [النساء 144:4]

’’اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے خلاف اللہ کی کھلی حجت قائم کرا لو‘‘

- یہی عقل و دانش پر مبنی رویہ ہے

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ [118:3]

’’اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تمہارے لیے تمام نشانیاں واضح کر دی ہیں۔‘‘

- اللہ کا راستہ ہدایت کا راستہ ہے، کفار سے دوستی اور پیروی کا نہیں

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى [120:2]

’’ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے۔‘‘

ان آیات کے بارے میں مغربی ممالک کا یہ پراپیگنڈا غلط ہے کہ قرآن مسلمانوں کو دوسروں سے نفرت سکھاتا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے یہ نہیں کہا کہ وہ غیر مسلموں سے نفرت کریں یا ان سے دشمنی کریں یا ان سے خواہ مخواہ لڑائی کریں بلکہ قرآن حکیم نے جا بجا مسلمانوں کو یہ سکھایا ہے کہ بنی آدم تمہارے بھائی ہیں اور ان سے محبت اور خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت کے خسران عظیم سے بچانے کے لیے حق ان تک پر امن طریقے سے، پیار اور محبت سے پہنچاؤ تاکہ وہ آخرت میں عذاب سے اور دنیا میں فساد فی الارض سے بچ سکیں اور دونوں جہانوں میں امن وسکون و کامیابی کی زندگی گزاریں۔تاہم، بلا شبہ، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مدافعت کا حکم بھی دیا ہے خصوصاً جب کوئی دشمن ان پر چڑھ دوڑے، ان پر ظلم کرے اور ان کی عزت و آبرو اور حفظِ ناموس و وطن خطرے میں پڑ جائے (۱۴) اور ظاہر ہے اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کیوں کہ دنیا کا ہر قانون اور ضابطہ، یہاں تک کہ اہل مغرب کی قائم کردہ 'اقوام متحدہ' بھی، افراد اور قوموں کو اپنی جان، مال، عزت اور وطن کی حفاظت کا حق دیتی ہے۔علاوہ ازیں اسلام ان متعصب اور جابر حکمرانوں کی طاقت توڑنے کی بھی حمایت کرتا ہے جو اپنی رعایا کو غیر جانبداری کے ماحول میں اسلام کو سمجھنے اور سمجھ کر قبول یا رد کرنے کا اختیار نہیں دیتے اور اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، بشرطیکہ مسلمان یہ کر سکنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ظاہر ہے یہ بھی ایک شریفانہ اور مبنی بر انصاف موقف ہے کیونکہ اسلام کسی کو جبر سے مسلمان بنانے کی حمایت نہیں کرتا (۱۵) اور نہ مسلم تاریخ میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں نے کسی قوم کو طاقت اور دھونس سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگرچہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے مسلمانوں سے دشمنی کے بارے میں جو فرمایا ہے وہ سچ ہے اور وہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے تاہم جو چیز ہمارے اس ایمان کو پختہ کرتی ہے وہ ہمارا مشاہدہ و تجربہ ہے۔انبیاء اور ان کی مخاطب قوموں سے کشمکش کے احوال، خود نبی کریم ﷺ سے ان کے مخالفوں کا طرز عمل، صلیبی جنگیں، پچھلی دو تین صدیوں میں غیر مسلموں کا مسلم ممالک پر قبضہ کرنا، انہیں قوت سے کچلنا، ان کے اموال لوٹ لینا، ان کے (اجتماعی زندگی) کے ادارے توڑ کر انہیں اپنے کافرانہ اصولوں پر استوار کرنا، پھر ہمارے دیکھتے عراق اور افغانستان کو تباہ کرنا، لیبیا میں مداخلت کرنا، نیز پاکستان، یمن اور مالی پر کفار کے حملے اب بھی جاری ہیں اور فلسطین، چیچنیا، کشمیر، کوہ قاف اور ترکستان میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کے ظلم وستم اِس وقت بھی جاری ہیں۔پاکستان کے اندر کراچی، بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے اسلام، مسلم اور پاکستان دشمن قوتوں کا فعال ہونا بالکل واضح ہے۔غیر مسلموں کا مسلمانوں کی معیشت تباہ کرنے، ان

کے نظامِ تعلیم اور میڈیا کو اپنے

زیر اثر رکھنے، ان کی معاشرتی قدریں برباد کرنے اور سب سے بڑھ کر مسلم ممالک کے حکمرانوں کو اپنا گماشتہ بنا کر رکھنے جیسے کام ہمارے مشاہدے اور تجربے میں ہیں۔ چنانچہ قرآن وسنت نے تو ہماری اصولی رہنمائی فرمائی ہے کہ کفار تمہارے دشمن ہیں لیکن ہم تو کھلی آنکھوں ان کی اسلام اور مسلم دشمنی صاف دیکھ رہے ہیں لہذا اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش موجود نہیں کہ کفار مسلمانوں کے بدخواہ اور دشمن ہیں۔

## ۳۔ اہل کفر سے معاشرت کی مذمت

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

**'من جامع المشرک و سکن معه فانه مثله'**(۱۶)

یعنی جو مشرکوں کے ساتھ رہے اور ان کے ساتھ رہائش رکھے وہ انہی کی مانند ہے۔

نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے مسلمانوں سے جو کفار کے ساتھ رہیں، اظہار برأت فرمایا اور کافر معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اگر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں تو ان کی (پوری کی بجائے) آدھی دیت ادا کرنے کا حکم دیا:

**"بعث رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرية الى خثعم فاعتصم ناس منهم بالسجود فاسرع فيهم القتل ۔قال فبلغ ذلک النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فامر لهم بنصف العقل وقال "انا برئ من کل مسلم يقيم بين اظهر المشرکين"۔قالوا يا رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لم؟قال: 'لاترانی ناراهما'**(۱۷)۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی خثعم کی طرف ایک سریہ بھیجا (جنگ شروع ہوئی) تو کچھ لوگوں نے سجدوں کے ذریعے جان بچانا چاہی (یعنی اپنے آپ کو مسلمان باور کرانے کی کوشش کی) لیکن مسلمانوں کے سپہ سالار نے (اس کے باوجود) جنگ تیز کردی اور وہ لوگ قتل کر دیے۔ جب یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی آدھی دیت ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکوں کے ساتھ رہے۔ لوگوں نے پوچھا "وہ کیوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؟" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی یکجا معاشرت کی وجہ سے، ان میں باہم تمیز نہ کرسکنے کے سبب۔

انہی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لاتستضیئوا ابنار المشرکین"(۱۸)

یعنی غیر مسلموں کی آگ سے آگ نہ جلاؤ۔

مطلب یہ کہ ان سے معاشرتی تعلقات نہ رکھو، ان کے قریب نہ رہو۔ ان سے لینا دینا نہ رکھو، ان کی محتاجی سے بچو، اپنی ضروریات میں خود کفیل رہو.... وغیرہ اور امام حسن بصری سے اس حدیث کی یہ تشریح منقول ہے کہ 'اپنے امور میں ان سے مشاورت نہ کرو'(۱۹)۔

## ۴۔ لزومِ ہجرت (یعنی لزوم ترک معاشرت مع الکفار)

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں قیام دارالاسلام یعنی اسلامی ریاست کے قیام کے بعد عرب کے مسلمانوں پر دارالکفر سے مدینہ کی طرف ہجرت لازم کردی اور دارالاسلام کی موجودگی میں دارالکفر میں رہنے سے منع کیا اور ہجرت کر کے دارالاسلام نہ جانے والوں کی مذمت کرتے ہوئے انہیں جہنم کی وعید سنائی:

"اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیٓ اَنْفُسِھِمْ قَالُوْا فِیْمَ کُنْتُمْ قَالُوْا کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا فِیْھَا فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا [۴:۹۷]

"جو لوگ ہجرت نہ کر کے اپنے لیے برا کر رہے ہیں جب فرشتے ان کی جان قبض کریں گے تو ان سے پوچھیں گے 'تم کس حال میں تھے؟' وہ کہیں گے 'ہم اپنے ملک میں بے بس تھے؟' فرشتے کہیں گے 'کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم دوسری جگہ ہجرت کر جاتے؟' یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

- اور جنہوں نے اس کے باوجود ہجرت نہیں کی اللہ تعالیٰ نے ان سے انقطاع ولایت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"۔۔۔والذین امنوا ولم یھاجرو مالکم من ولا یتھم من شیئٍ حتی یھاجروا۔۔۔" (الانفال ۸:۷۲)

"وہ لوگ جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو اے مسلمانو! ان سے تمہارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں"

چنانچہ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ اس سے مقصود قطع ولایت ہے، محض وراثت نہیں، بسبب ہجرت

نہ کرنے والوں سے صدور فسق کے (۲۰)

-اور رسول کریم ﷺ نے ان کے ایمان کو غیر معتبر قرار دیتے ہوئے ان سے اظہار برأت فرمایا:

**"انا برئ من کل مسلم یقیم بین اظھر المشرکین، قالوا یا رسول اللہ لم؟ قال: لاترانی نار اھما" (۲۱)۔**

- اور اگرچہ فتح مکہ کے بعد مدینہ کی طرف جسمانی ہجرت تو فرض نہ رہی (۲۲) لیکن جمہور علماء کے نزدیک ایسی جگہ سے ہجرت کر کے جہاں ایک مسلمان اسلامی احکام کے مطابق آزادانہ زندگی بسر نہ کر سکے، کسی دوسری ایسی جگہ جانا جہاں وہ اسلامی حکام پر آزادانہ عمل کر سکے اور اسلامی زندگی بسر کر سکے، آج بھی ضروری ہے۔ یہی رائے متقدمین اور متاخرین فقہاء کی ہے۔ عصر حاضر میں عالم عرب سے، سعودی عرب کی مرکزی مجلس افتاء نے اس پر (بشرط استطاعت) اجماع امت کا ذکر کیا ہے (۲۳) اور برصغیر کے علماء میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی، (۲۴) مولانا بدر عالم میرٹھی، (۲۵) مولانا عبدالحق حقانی (۲۶) اور مولانا عبدالقدیر صدیقی (۲۷) نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

قرآن وسنت کی ان نصوص کی روشنی میں متقدمین اور متاخرین فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم معاشرے یعنی دارالکفر میں جا کر رہنا صحیح نہیں (خواہ وہ مسلمانوں سے معاہدے کے نتیجے میں دارالصلح ہو یا ان کے معاندانہ رویے کی وجہ سے دارالحرب ہو) کیونکہ وہاں اسلامی احکام پر آزادانہ عمل اور اسلامی زندگی گزارنے کی آزادی میسر نہیں ہوتی جو دراصل دین کا مقصود اعظم ہے چنانچہ امام خطابی سطور بالا میں ذکر کردہ حدیث جریر کی تشریح میں کہتے ہیں:

> "اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالاسلام اور دارالکفر کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے لہٰذا کسی مسلمان کے لیے کافروں کے وطن میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔" (۲۸)

## ۵۔ دارالکفر میں عارضی قیام کی اباحت

قرآن وسنت کے مذکورہ بالا احکام سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت مسلمانوں کے دارالکفر سے دارالاسلام ہجرت کی حامی ہے اور مسلمانوں کا دارالکفر میں رہنا اس کے نزدیک ناپسندیدہ اور غیر مطلوب ہے۔ تاہم اس اصول سے بطور استثناء اور مشروط طور پر کچھ چیزوں کو الگ کیا جا سکتا ہے جیسے بعض ٹھوس مصالح کی خاطر دارالکفر میں عارضی قیام مثلاً:

۱۔ بغرض تبلیغ و اشاعت دین (بشرطیکہ اپنے دین و ایمان کو خطرہ نہ ہو اور کفار سے متاثر ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو بلکہ یقین واثق ہو کہ ان کو دین کی طرف راغب کر سکے گا)۔

۲۔ تجارت (جیسا کہ امام خطابی کا قول ہے کہ: ''اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو اس کے لیے وہاں ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے''۔ (۲۹)

## ۳۔ سفارت

۴۔ کسی غیر صالح مسلمان حکمران کے جبر وظلم سے تنگ آ کر کسی کافر ملک میں پناہ لینا (بشرطیکہ کسی مسلمان ملک میں پناہ نہ مل سکتی ہو) (۳۰)۔

۵۔ برائے علاج (مثلاً حالت اضطرار میں جان بچانے کے لیے ایسا آپریشن جو کسی مسلم ملک میں نہ ہو سکتا ہو)

۶۔ برائے تعلیم (صرف ایسی مہارتوں اور علوم کے لیے جو مسلم ممالک میں موجود نہ ہوں لیکن مسلم معاشرے کے لیے ناگزیر ہوں)

ظاہر ہے دارالکفر میں عارضی قیام کسی مسلم فرد یا معاشرے کے حقیقی مصالح سے مشروط ہے اور اس کی حیثیت اصل 'حکم شرعی' سے جو عدم جواز کا ہے، محض استثناء کی ہے لہذا ان استثناءات کا غلط استعمال ناقابل قبول بلکہ قابل مذمت ہے۔ اصل یہ ہے کہ مستقل طور پر دارالکفر میں رہنا ایک مسلمان کے ایمان وعمل کے لیے خطرناک ہے چنانچہ علماء کرام اگر کسی کو دارالکفر میں رہنے کی اجازت دیتے ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ ''وہاں جا کر دین و ایمان کے تحفظ، احکام دین پر عمل اور کسی حرام کے اندر مبتلا نہ ہونے کا یقین ہو''(۳۱) چنانچہ سعودی دارالافتاء کے مفتیوں نے علماء کے لیے بغرض تبلیغ وہاں جانے پر بھی یہ پابندی لگائی ہے کہ **''اذا لم یخش الفتنه فی دینه و کان یرجو التاثیر فیهم و هدایتهم''**(۳۲) یعنی بشرطیکہ اسے اپنے دین میں فتنے کا اندیشہ نہ ہو اور غیر مسلموں پر اثر انداز ہونے اور ان کے ہدایت پانے کی قوی امید ہو۔

اسی لیے شریعت نے مسلمانوں کو التزام جماعت کا حکم دیا ہے یعنی مسلم معاشرے اور ریاست میں رہنے کو لازمی قرار دیا ہے اور اس پر عمل نہ کرنے والے کو **''مات میتة جاهلیة''**(۳۳) (یعنی جسے اس حالت میں موت آئی گویا وہ جاہلیت کی موت مرا) قرار دیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے کسی غیر مسلم معاشرے میں جا کر مستقل رہنے کا عمومی فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں البتہ اگر کسی کا ایمان مضبوط اور عمل مستحکم

ہواور اسے یقین ہو کہ وہ کافر معاشرے سے متاثر ہونے کی بجائے اسے متاثر کرسکتا ہے تو وہ انفرادی طور پرخطرہ مول لے کر یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ وہ بغرض اشاعت دین کسی غیر مسلم معاشرے میں جا کر رہے جس طرح کہ مسلمان صوفیاء، علماء اور تاجروں نے ہندوستان، انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپین ۔۔۔وغیرہ میں اسلام کی کامیاب اشاعت کی۔

## ۶۔ بعض مغالطوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ

یہ ایک حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اس تہذیب کے علم بردار ممالک امریکہ، یورپ، آسٹریلیا، جاپان ۔۔۔وغیرہ دنیاوی لحاظ سے خوش حال ہیں۔ دوسری طرف مسلمان اور ان کی تہذیب مغلوب ہے اور مسلم ممالک کی اکثریت غربت وافلاس میں مبتلا ہے لہذا مسلم ممالک کے کئی مسلمان شہری زیادہ پیسے کمانے کے لالچ میں، معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں اور دنیاوی سہولتیں (فریج، ٹی وی، کار، بنگلہ، بنک بیلنس ۔۔۔وغیرہ) حاصل کرنے کے لیے غیر مسلم ممالک میں جاتے ہیں اور وہاں کی غیر مسلم تہذیب سے مرعوب ومتاثر ہوکر اس معاشرے میں جذب ہوکر رہ جاتے ہیں اور دین وایمان سے جاتے ہیں اور اگر ان میں کچھ دین وایمان کے اثرات باقی رہیں بھی تو ان کی آنے والی نسلیں بہر حال مسلمان نہیں رہتیں۔ ظاہر ہے اِن حالات میں مسلمانوں کو دولت کمانے اور دین گنوانے کی شرعاً اجازت نہیں دی جاسکتی۔

بعض لوگ اس دلیل کو رد کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو بیرون ملک کام کرتے ہیں وہ مسلم ممالک کو قیمتی زرمبادلہ بھجواتے ہیں لہذا ان کی بیرون ملک سکونت کو غیر شرعی قرار دینا صحیح نہیں ہے اور اس طرح کا فتوی دینا ملکی معیشت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ہماری رائے میں اس بات میں زیادہ وزن نہیں ہے خصوصاً اگر مندرجہ ذیل امور سامنے رکھے جائیں:

- مسلم ممالک خصوصاً پاکستان میں معیشت کی بدحالی کی وجہ وسائل کی کمی نہیں بلکہ مسلم حکمرانوں کی کرپشن، شاہ خرچیاں اور بدعنوانیاں ہیں اور اس کرپشن اور بدعنوانی کو مغربی ممالک اور ان کے مالی اداروں نے اسلام اور مسلم دشمنی میں عمداً بلکہ منصوبہ بندی سے مسلم ممالک میں فروغ دیا ہے اور وہ آمروں اور کرپٹ حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنا کر حکومت میں لاتے اور ان کے اقتدار کو طول دیتے ہیں۔

- غیر مسلم خصوصاً مغربی ممالک آج بھی تجارت کو اپنے یعنی غیر مسلم ممالک کے اندر محدود رکھتے اور فروغ دیتے ہیں اور مسلم ممالک سے تجارت کر کے ان کو مالی فائدہ نہیں پہنچنے دیتے۔

- مغربی ممالک مسلمان پروفیشنلز (ڈاکٹروں، انجنیئروں، سائنس دانوں، پروفیسروں) کو زیادہ تنخواہ اور سہولتوں کا لالچ دے کر ان کی خدمات سے اپنے معاشرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور مسلم ممالک کو ان کی خدمات سے محروم کر دیتے ہیں حالانکہ مسلم ممالک کا کثیر سرمایہ ان افراد کی تعلیم وتربیت پر خرچ ہوتا ہے۔

- پاکستان مسلم ممالک سے معاہدے کر کے اپنی لیبر فورس دوسرے مسلم ممالک کو بھجوا سکتا ہے اور ان سے تجارت کو فروغ دے سکتا ہے تاکہ ہماری لیبر مسلم ماحول میں رہے اور دونوں مسلم ممالک کو لیبر کے تبادلے اور تجارت سے مالی فائدہ بھی ہو۔

- مسلم ممالک کی طرف سے مغربی ممالک کو لیبر فورس مہیا کرنے کا کام ریاستی سطح پر کیا جائے اور ان سے شرائط کار منوائی جائیں جیسے باجماعت نماز کی اجازت، اسلامی تہواروں پر چھٹی کی اجازت وغیرہ اور اسے افراد پر نہ چھوڑا جائے کہ وہ خود وہاں جاکر ملازمت تلاش کریں۔

- یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان میں جو زرمبادلہ آرہا ہے۔ وہ زیادہ تر مسلم ممالک سے آرہا ہے مغربی ممالک چونکہ دور ہیں اور وہاں شہریت یا بزنس اور دیگر سہولتیں زیادہ ہیں لہذا جو پاکستانی پروفیشنلز وہاں جاتے ہیں وہ وہاں شادی کر لیتے ہیں یا پاکستان سے اپنی فیملی وہاں بلا لیتے ہیں اور یوں ان کے پیسے وہیں خرچ ہوجاتے ہیں اور وہ کوئی خاص زرمبادلہ پاکستان نہیں بھجوا پاتے۔

- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو مسلمان مغربی ممالک میں معیار زندگی بلند کرنے جاتے ہیں اور وہاں مستقل رہائش اختیار کر لیتے ہیں ان کی بہت بڑی اکثریت (اندازاً ۸۰ تا ۹۰ فی صد) وہاں کے غیر اسلامی ماحول میں جذب ہوجاتے ہیں اور اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے، نہیں کر پاتے اور خصوصاً ان کی آئندہ نسلوں کے اچھا عملی مسلمان بننے کے امکانات ختم ہوجاتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے مصداق وہ ان یہودیوں عیسائیوں کے ساتھ رہتے ہوئے ان جیسے ہی ہوجاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ہر لحاظ سے خسارے کا سودا ہے اور اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ تھا مسلمانوں کے غیر مسلم ممالک میں جاکر رہنے کی شرعی حیثیت کے حوالے سے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے سوائے بعض استثنائی امور کے جن میں بعض حقیقی مصالح کی خاطر عارضی طور پر دارالکفر میں قیام کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ دین وایمان کو خطرہ نہ ہو۔ اب ہم مستفتی کے اصل سوال کی طرف آتے ہیں کہ کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم مغربی ممالک کی شہریت اختیار کرنا اور اس کا حلف اٹھانا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟ **(جاری ہے)**

# حواشی

(۱) صحیح مسلم، الطہارۃ ۵۶

(۲) سنن ابی داؤد، لباس ۴

(۳) مسند احمد بن حنبل، ج ۶ ص ۳۲۴

(۴) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم عاشورا

(۵) البقرہ ۲:۔ ۱۴۴۔۱۴۵

(۶) مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۲۶۴

(۷) البقرہ ۱۹۹، ۲:۱۹۸

(۸) التوبہ ۳۷:۹

(۹) التکویر: ۸۹:۸۱

(۱۰) النسا: ۲۲:۴

(۱۱) صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء باب ماذکر عن بنی اسرائیل

(۱۲) صحیح مسلم، الحیض باب جواز غسل الحائض حدیث رقم ۳۰۲

(۱۳) Encyclopedia of Islam, Vol. 10, P-122, Leiden, 2000

(۱۴) النساء ۷۵:۴

(۱۵) البقرہ ۲:۔۲۵۶

(۱۶) سنن ابی داؤد، باب الاقامہ فی ارض الشرک

(۱۷) الطبرانی، المعجم الکبیر، جلد دوم

(۱۸) سنن نسائی، کتاب الزینۃ، باب لاتنقشوا علی خواتیمکم عربیاً

(۱۹) امام ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۱، ص ۳۹۸، سہیل اکیڈمی لاہور ۱۹۷۲ء

(۲۰) دیکھیے مثلاً مولانا ثناءاللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ج ۴، ص ۱۱۵

(۲۱) الطبرانی، المعجم الکبیر، جلد دوم

(۲۲) صحیح بخاری، باب فضل الجہاد و السیر

(۲۳) سعودی دارلافتاء،فتوی ۲۳۹۳، سوال نمبر ۶
(۲۴) تفسیرعثمانی
(۲۵) ترجمان السنۃ، باب نھی عن المنکر تکثیر سواد المشرکین، ج ۲ ص ۳۷۱
(۲۶) تفسیرحقانی، ج ۲ص ۴۸۰ مکتبہ خیرکثیر کراچی
(۲۷) تفسیرصدیقی، ج ۲ص ۳۱۱، ادارہ اشاعت تفسیرصدیقی کراچی
(۲۸) معالم السنن للخطابی، ج ۳ص ۴۳۷
(۲۹) نفس المرجع
(۳۰) جیسے مصر میں مسلم حکمرانوں سے جان بچا کر محمد قطب سعودی عرب آ گئے یا شیخ یوسف القرضاوی قطر چلے گئے یا فلسطینی اور افغان مسلمان ہمسایہ ملکوں میں ہجرت کر گئے۔
(۳۱) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، ج ا
(۳۲) فتوی سعودی دار الافتاء
(۳۳)صحیح بخاری، فتن ۲

## اصل جنگ

سکندراعظم کی ملاقات ایک جنگ کے دوران ایک فقیر (درویش) سے ہوئی۔

فقیر: یہ جنگ جیتنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟

سکندر: ایک جنگ اورلڑوں گا۔

فقیر: اس کے بعد؟

سکندر: پھر ایک جنگ اورلڑوں گا۔

فقیر: آپ پوری دنیا فتح کرلو اس کے بعد؟

سکندر: پھر آرام سے زندگی گزاروں گا۔

فقیر: وہ تو میں بنا جنگ لڑے بھی گزار رہا ہوں......بس ایک جنگ لڑی تھی اپنے نفس کے خلاف۔

(ایم اے خان)

تزکیۂ نفس افادات احمد جاوید

# ذکر انسانی شخصیت کو بدل دیتا ہے

ذکر سے مراد ہے اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا۔ یہ مشروع اور منصوص ہے یعنی حکم قرآن وسنت ہے۔ لہٰذا جو لوگ کثرت ذکر کو صوفیوں کی اختراع سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ کثرت ذکر بلکہ دائمی ذکر سنت رسول ﷺ ہے اور ظاہر ہے دین نام ہی اتباع سنت کا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں حصول رضائے الٰہی کا انحصار اتباع سنت ہی پر ہے اور سنت یہ ہے کہ ذکر اللہ کثرت سے کیا جائے۔

جدید نفسیات بھی اس اصول کی تائید کرتی ہے کہ آپ جو کرنا اور بننا چاہتے ہیں اس کا اظہار بار بار اپنی زبان سے کریں، خود کو اس کی ترغیب دیں یہاں تک کہ وہ خیال آپ کے دل ودماغ میں جم جائے اور آپ کی شخصیت اس کے مطابق ڈھل جائے۔

محقق صوفیاء کے نزدیک ذکر کی تین سطحیں ہیں: قال، خیال اور حال۔ قال ہے زبان سے ذکر کرنا۔ جب زبان سے ذکر کثرت سے اور توجہ سے کیا جاتا ہے تو وہ دل ودماغ میں رچ بس جاتا ہے اس کے نتیجے میں اللہ کا استحضار نصیب ہو جاتا ہے کہ اللہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے ترک معصیت کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ذکر حال بن جائے یعنی اعضاء وجوارح اس ذکر کے تقاضوں کے مطابق عملاً حرکت میں آنے لگیں۔ اصل مطلوب یہی ہے کہ ذکر قال نہ رہے حال بن جائے لیکن قال ہوگا تو حال بنے گا لہٰذا ذکر سے غفلت روا نہیں۔ ذکر کیجیے اور کثرت وتوجہ سے کیجیے کہ دل ودماغ میں پختہ ہو جائے۔

اگر روزانہ دن میں کسی کو سو بار پاگل کہو تو وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گا تو اگر سو بار دن میں اللہ اکبر کہو تو اللہ کی کبریائی اور اپنے ہیچ ہونے کا تصور دل دماغ میں کیوں نہیں جمے گا؟ اور اللہ کے احکام کی اتباع اور فرمانبرداری کا رجحان کیوں ترقی نہیں کرے گا؟ لہٰذا کثرت ذکر کو معمول بنانا ضروری ہے۔ اللہ کا ذکر کیجیے، کثرت سے کیجیے، توجہ سے کیجیے تاکہ قال، خیال اور حال بن جائے اور آدمی اللہ کا بندہ بن جائے۔

# قارئین البرہان کے نام

① جن اصحاب نے ایک دفعہ سالانہ چندہ بھجوایا جو ختم ہوگیا لیکن پرچہ اب بھی ان کو مل رہا ہے۔ وہ اگلے سال کے لیے زر اعانت بھجوادیں یا ہو سکے تو تاحیات خریدار بن جائیں۔

② اگر آپ کے پاس پرچہ اعزازی آتا ہے اور آپ کو پسند ہے اور آپ مالی وسعت رکھتے ہیں تو ۴۰۰ روپے سالانہ زر اعانت اس زمانے میں کوئی بڑی بات نہیں، بھجوادیجیے تاکہ انتظامیہ پر مالی بوجھ کم ہو۔

③ اگر آپ خوشحال ہیں اور پرچہ آپ کو پسند ہے تو ۵۰۰۰ روپے بھجوا کر تاحیات خریدار بن جائیں۔ اگر آپ کاروبار، تجارت یا مارکٹنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں تو البرہان کو اشتہار دیجیے یا دلوائیے۔

④ اگر پرچہ آپ کو اعزازی طور پر ملتا ہے اور آپ کی دلچسپی اور پسند کا نہیں تو از راہ نوازش خط، SMS، ای میل یا فون کے ذریعے مطلع فرمادیں تاکہ اس کی ترسیل بند کردی جائے۔

⑤ اگر آپ مالی طور پر کمزور ہیں لیکن البرہان پڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں مطلع کیجیے، ہم پرچہ آپ کے نام جاری کردیں گے۔ لیکن اگر آپ ۴۰۰ روپے سالانہ ادا کر سکتے ہیں تو پرچہ فری نہ منگوائیے، خرید کر پڑھیے۔

⑥ البرہان کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیے، خود خرید کر پڑھیے، دوسروں کو خریدنے کی ترغیب دیجیے، دوسروں کو خرید کر دیجیے۔ اس کی ایجنسی لیجیے۔ اس کے تاحیات خریدار بنیے۔

⑦ مدیر البرہان کی کتابیں بلا معاوضہ مانگ کر شرمندہ نہ کیجیے۔ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ اتنی مالی سکت نہیں رکھتا کہ کتابیں طبع اور تقسیم کرے۔ ہم قارئین کی سہولت اور اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے صرف اتنا کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی جو کتابیں مختلف پبلشرز نے طبع کی ہیں، وہ خرید کر طلب کرنے والوں کو بھجوا دیتے ہیں۔ اگر آپ کو ٹرسٹ کے مقاصد سے دلچسپی ہے تو کتابوں کی طباعت و تقسیم میں ادارے سے مالی تعاون فرمائیے۔

عبدالمجید

(سرکولیشن مینیجر)

اسلامی تحریکیں

جمیل الرحمن عباسی

# تنظیم اسلامی کا منہج اور چند مغالطے

ماہنامہ البرہان بابت ماہ دسمبر ۲۰۱۳ء میں جناب محمد رشید صاحب کا ایک مضمون ’’غلبہ اسلام بذریعہ احتجاجی سیاست۔ تنظیم اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات‘‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس مضمون میں تنظیم کے فکر وطریق پر کچھ نقد فرمایا گیا ہے۔ یہ تنقید امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید صاحب کے اُس خطاب کی روشنی میں کی گئی ہے جو اُنہوں نے ’’پاکستان میں اس کے قیام سے اب تک ،احیائے اسلام کی کوششوں کا جائزہ‘‘ کے عنوان سے سیمینار (منعقدہ ۲۱ جون ۲۰۱۳ء بمقام کراچی) میں ارشاد فرمایا تھا۔ یہ خطاب بعد میں ماہنامہ میثاق کی اشاعت بابت اکتوبر ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ صاحبِ مضمون نے تنظیم اسلامی کے فکر وطریق پر جو اعتراضات وارد فرمائے ہیں اُس حوالے سے چند وضاحتیں ذیل میں تحریر کی جا رہی ہیں:

## پہلا اعتراض:

صاحبِ مضمون لکھتے ہیں:

> تنظیم اسلامی کے امیر محترم حافظ عاکف سعید صاحب اپنے خطاب بعنوان ’’پاکستان میں اس کے قیام سے اب تک ...... احیائے اسلام کی کوششوں کا جائزہ‘‘ (منعقدہ ۲۱ جون ۲۰۱۳ء بمقام کراچی ،شائع شدہ ماہنامہ میثاق بابت اکتوبر ۲۰۱۳ء) میں مولانا مودودی مرحوم کی ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہونے والی ایک نہایت اہم تحریر کا حوالہ دیتے ہیں ،جس میں مولانا مرحوم نے فرمایا کہ:
>
> ’’واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔‘‘
>
> اس کے بعد سید مودودی مرحوم پہلے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے ’’انتخابات‘‘ کو ایک عارضی اور آزمائشی طریقہ کے طور پر ذکر کرنے کے بعد دوسرے طریقے کی تفصیل ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:
>
> ’’دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ

جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔‘‘

اس کے بعد مولانا نے تحریر فرمایا کہ ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ناکام ہوئے تو ہم دوسرے طریقے کی طرف لوٹ جائیں گے۔ جناب عاکف سعید صاحب نے اس تحریر کا حوالہ دینے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ:

’’اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بہر حال یہ دو طریقے ہیں اور قیام پاکستان کے بعد جس طریقہ کار (یعنی انتخابات کے ذریعے نفاذ شریعت) کو اختیار کیا گیا وہ وقتی طور پر تھا بایں طور کہ اگر کامیابی نہیں ملتی تو ہم پھر واپس پہلے طریقے (یعنی انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعت) کی طرف لوٹ جائیں گے۔‘‘

حیرت کی بات یہ ہے کہ سید مودودی مرحوم ومغفور غلبۂ اسلام کے جس طریقے کو اپنی تحریر میں بغیر کسی رنگ آمیزی کے دین کی خالص اور سادہ اصطلاح کی ترجمانی کرتے ہوئے ’’عمومی تحریک اصلاح‘‘ کے واضح عنوان سے ذکر فرما رہے ہیں جناب عاکف سعید صاحب سید مودودی مرحوم کی تحریر کے مندرجات درج کرنے کے باوجود اس دوسرے طریقے کو اصل کا نام دینے سے کترا جاتے ہیں اور مولانا مودودی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طریقے کو ’’انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعت‘‘ کے نام سے بدل دیتے ہیں‘‘۔

## جواب:

صاحبِ مضمون کا اعتراض یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جس طریقِ کار کو ’’اصلاحی‘‘ کہا تھا جناب عاکف سعید صاحب نے اُسے ’’انقلابی‘‘ کے نام سے موسوم کر دیا۔ اِس اعتراض پر تبصرہ سے پہلے مناسب ہوگا کہ مولانا مَودودیؒ کی وہ پوری تحریر نظر سے گزار لی جائے جس کے صرف ایک اقتباس کا حوالہ جناب عاکف سعید صاحب نے دیا ہے۔ دراصل مولانا مودودیؒ کی تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ اُن سے پوچھا گیا تھا کہ آپ اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرایا جائے؟ مولانا یوں جواب دیتے ہیں:

’’ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو نہ اخلاق اسلامی ہوں، جہاں کا سیاسی ومعاشی وتعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو، اور جہاں مجرد ایک سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یکا یک نوبت آ گئی ہو۔ وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی بات پر اٹکا ہو کہ ہم دستور مرتب کر کے پیش کریں اور برسر اقتدار لوگ اسے لے کر نافذ کریں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ ایک مدرسے یا ایک بینک کو ہسپتال بنا

دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہسپتال کا خاکہ مرتب کر دیں اور وہ مدرسے کے معلمین یا بینک کے اسٹاف کو دے دیا جائے تا کہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ شاید دستور کو انہوں نے کوئی تعویذ سمجھا ہے۔

واضح طور سمجھ لیجیے یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے: ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اصولاً ضروری ہوں۔ (جنہیں ہم نے اپنے مطالبے میں بیان کر دیا ہے) پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے، پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں اور وہ حکومت کی طاقت و ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا لیکن خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہو گا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطہ نظر سے ہم اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے

تھے۔اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے،جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے''۔

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء،رسائل ومسائل زیرعنوان،قیام نظام اسلامی کی صحیح ترتیب)

تقسیم سے پہلے کا طریقہ، جسے مندرجہ بالا مضمون میں مولانا مودودیؒ نے 'دوسرا طریقہ'اور'عمومی تحریک اصلاح' سے معنون کیا ہے، الفاظ کے پیرائے میں یوں بیان ہوا ہے''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور وارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے''۔ اِس طریقے کو جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے انقلابی طریقہ قرار دے کر صاحبِ مضمون کی رائے کے مطابق مولانا مودودیؒ کے موقف کی غلط تعبیر کی ہے۔صاحبِ مضمون محمد رشید صاحب کے اس الزام کو پرکھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ مولاناؒ کی قبل تقسیم کی تحریروں کی طرف رجوع کیا جائے جن میں اس''دوسرے طریقے'' کی پوری تفصیلات موجود ہیں،جس کا ذکر مولاناؒ کے مذکورہ بالا اقتباس میں مختصراً صرف دوسطروں میں کیا گیا ہے۔اورانہی دوسطروں کی بنیاد پر رشید صاحب مولانا کے قبل از تقسیم طریق کار کو'اصلاحی'' قرار دینے پر بضد ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودی اپنی، قیام پاکستان سے قبل کی عمومی تحریک اصلاح کو'**انقلابی تحریک**'ہی سمجھتے تھے۔ اِس کے لیے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا سرسری سا جائزہ لینا ہی کافی ہے۔مثلاً مولانا مودودی اپنی کتاب'جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ، اور لائحہ عمل، اشاعت اوّل نومبر ۱۹۵۱ء، میں زیرعنوان'متحدہ ہندوستان میں ہمارا موقف' قبل از تقسیم کی اپنی جدوجہد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''(متحدہ ہندوستان) میں انتخابات میں حصہ لینا ہمارے لیے شرعاً صحیح نہ تھا۔ اس لیے ہم نے اس زمانے میں پرامن،غیرخفیہ،**انقلابی دعوت** کا طریقہ اختیار کررکھا تھا''۔

تبلیغی جماعت کے طریقہ تبلیغ اختیار کرنے کی تجویز کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں:

''جس قسم کا **کلی انقلاب** ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے وہ طریقہ کچھ بھی مددگار نہیں ہو سکتا''۔(روداد جماعت اسلامی،حصہ سوم،صفحہ ۱۶۲)

اسلامی حکومت کے قیام کے طریق کار کے بارے میں سید ابوالاعلی مودودیؒ کا موقف پہلی بار''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے'' کے موضوع پر ان کی تقریر کے ذریعہ ۱۹۳۹ء میں سامنے آتا ہے۔اِس تحریر میں مولانا باقاعدہ'**اسلامی انقلاب کی سبیل**' کی سرخی لگا کر اسلامی انقلاب کے منہج کو یوں واضح کرتے ہیں:

''درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔اس کے پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریہ حیات، وہ مقصد زندگی، وہ معیار اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص سانچے کی انسانیت میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں پھر اسی بنیاد پر تعلیم وتربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اسی مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرین مالیات ومعاشیات، مسلم ماہرین قانون، مسلم ماہرین سیاست، غرض ہر شعبہ علم وفن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر وفکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار ونظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کرسکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے نا خدا شناس آئمہ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی سیادت (intellectual leadership) کا سکہ جمادیں۔اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظام زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد وپیش میں پھیلا ہوا ہے۔اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں دے کر، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ کامل المعیار((Finest Standard)) سونا ہی پائے۔اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں۔اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، بااصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس میں ضرور انسان کیلئے عدل اور امن ہوگا۔اسی طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک میں کھنچ آئیں گے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجہ کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہوجائے گی، اور اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہوجائے گا۔آخرکار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہوجائے گا، جس کے لئے اس طور پر زمین تیار کی گئی ہو۔اور جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اس نظام تعلیم و

تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔ یہ ہے اس **انقلاب** کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو **اسلامی انقلاب** اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے''۔ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ دوم صفحہ ۱۷۰، ۱۷۱)

اب ملاحظہ فرمائیں وہ الفاظ جو امیر تنظیم اسلامی نے مولانا کے پیش کردہ طریقے کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں:

''یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے جو انقلابی راستہ تجویز کیا اپنے خطاب ''اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے'' میں بھی اور قیام پاکستان سے پہلے عملی نہج کے ذریعے بھی، اس جدوجہد کے آخری مراحل کے خدوخال زیادہ واضح نہیں کیے تھے۔ انقلابی نہج کے ابتدائی مراحل وضاحت سے بیان فرمائے، یعنی قرآن کے ذریعے افراد کے قلوب میں حقیقی ایمان کی ترویج و آبیاری کرنا، افراد کے ذہن وقلب میں انقلاب برپا کرنا اور ایک مضبوط ڈسپلن والی جماعت تیار کرنا، لوگوں کے اندر دین کا جذبہ اور نفاذ شریعت کی شدید پیاس اور تڑپ دل میں پیدا کرنا وغیرہ۔ ابتدائی طریقہ کار تو انہوں نے بڑی عمدگی سے بیان کیا لیکن آخری مراحل کو پورے طور پر واضح نہ کیا۔ اب یہ مصلحتاً بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت ان کا ذہن پوری طرح واضح نہ ہو''۔ (میثاق اکتوبر ۲۰۱۳ء، صفحہ ۳۲)

مولانا مودودیؒ کے الفاظ ''اسلامی انقلاب کی سبیل'' کو ''انقلابی راستہ'' کہنے اور ''انقلاب کے ظہور کا فطری طریقہ'' کو ''انقلابی منہج'' قرار دینے میں آخر، عربی اردو کے علاوہ فرق ہی کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ زیر بحث اقتباس میں مولانا علیہ الرحمہ نے لفظ اصلاح ہی استعمال کیا ہے۔ البتہ دیکھنا چاہیے کہ ان کے نزدیک اصلاح کا مفہوم کیا ہے؟ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ حافظ عاکف سعید صاحب کے انقلاب اور مولانا مودودیؒ کے تصور اصلاح میں کوئی مماثلت ہے یا نہیں؟ اور اگر مماثلت موجود ہو تو پھر مولانا کے لفظ اصلاح کو انقلاب سے تعبیر کرنے میں کوئی حرج باقی نہیں رہ جاتا۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

''یہ جماعت ان محدود معنوں میں کوئی سیاسی، مذہبی یا اصلاحی جماعت نہیں ہے جن میں عام طور پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں بلکہ یہ وسیع معنوں میں ایک اصولی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور عالم گیر نظریہ حیات پر یقین رکھتی ہے اور اپنے اس نظریہ کو عقائد و افکار میں، اخلاق و عبادات میں علوم و فنون، ادب و آرٹ میں تمدن و تہذیب میں، مذہب و معاشرت میں معاشی معاملات، سیاست اور نظام مملکت میں اور بین الاقوامی تعلقات اور روابط میں عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے''۔ (تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، صفحہ ۴۰)

کچھ آگے بڑھ کر مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی انفرادی واجتماعی میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے''۔(ایضاً صفحہ ۴۳)

''مسلمان نام ہے ہی اس بین الاقوامی اصلاحی وانقلابی پارٹی کا نام جو اسلام کے نظریہ ومسلک کے مطابق انسانی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے اس میدان میں قدم رکھے''۔

(روداد جماعت اسلامی حصہ چہارم، صفحہ ۳۴)

مولانا دین بیزار اقلیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''درحقیقت اقامت دین کی راہ کا روڑا یہی عنصر ہے۔ اسکو ہٹانا، عوام الناس کو اس کے اثر اور دباؤ سے نکالنا اور اقتدار کی مسندوں سے اس کو بے دخل کرنا ایک ایسا ناگریز تخریبی کام ہے جس کے بغیر کوئی تعمیری واصلاحی کام بار آور نہیں ہوسکتا''۔(جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ، اور لائحہ عمل صفحہ ۹۹)

اپنے پیشِ نظر کام کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''جو کام جماعت کے پیش نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظام زندگی کو بدلنا ہے، اسے دنیا کے اخلاق، سیاست، تمدن، معیشت، معاشرت، ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا میں جو نظامِ حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے۔ اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے''۔

(روداد جماعت اسلامی، حصہ اول، صفحہ ۱۶)

''اقامت دین میں 'دین' سے مراد اجزائے دین میں سے کوئی جزو مراد نہیں ہے خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو بلکہ دین بحیثیت مجموعی مراد ہے، اس کے کلیات بھی اور جزئیات بھی، عقائد بھی اور اعمال بھی''۔(روداد جماعت اسلامی، حصہ سوم، صفحہ ۱۹۴)

''ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے یعنی دنیا میں ہم جس آخری منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق وفجار کی امامت وقیادت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو اور اسی سعی وجہد کو ہم دنیا اور آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ دراصل فساق وفجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔۔۔۔۔۔ اب اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے، اضطراب کو امن سے، بداخلاقیوں کو اخلاق صالحہ سے، اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسن اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوع انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل

سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جا سکے''۔(روداد جماعت اسلامی، سوم، ۲۰۸، ۲۰۹ زیر عنوان تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں)

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عقائد و اخلاق اور اعمال، معاشرہ و تمدن کے ساتھ ساتھ قانون اور حکومت کی اصلاح بھی مولانا کے منصوبے میں شامل ہے اور ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے لیے تبدیلیٔ قیادت بھی ناگزیر ہے۔ اور اس منصوبے کے لیے وہ انقلاب کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی کئی تحریریں اور خطابات شاہد ہیں کہ اُن کے نزدیک اسلامی انقلاب صرف حکومتی ڈھانچے کی تبدیلی کا نام نہیں بلکہ ذاتی اور انفرادی زندگی میں انقلاب یا اصلاح بھی اُن کے پیش نظر ہے۔ نیز مولانا مودودی کی مندرجہ بالا عبارات سے تقابل کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ چاہے انقلاب کا استعمال ہو یا اصلاح کا، تصور دونوں خادمینِ دین کا ایک ہی ہے۔

## دوسرا اعتراض:

جناب محمد رشید صاحب لفظ انقلاب کے استعمال پر ان الفاظ میں تنقید کرتے ہیں:

''واضح رہے کہ تحریک اصلاح کا عنوان توجہات کو انفرادی و اجتماعی اصلاح پر مرکوز کرانے پر زور دیتا ہے جبکہ ''انقلابی تحریک'' کا لفظ توجہات کو اصلاح کے اہم ترین فریضہ سے ہٹا کر باتوں کا تیس مار خاں اور مستقبل کے خیالی نقشے کی بحث و تمحیص میں گم کر دیتا ہے۔ اصلاح کے لفظ سے عاجزی، انکساری ،عبدیت اور انسانی ہمدردی و غمخواری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے جبکہ انقلاب کے لفظ سے ہی غرور، تکبر ،نخوت ،خون خرابہ، تباہی اور بربادی کے پیغام نشر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام عبدیت ،تقویٰ اور اصلاح کا نعرہ بلند کیا کرتے تھے جبکہ جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے۔ چنانچہ دین کی دعوت دیتے ہوئے ''اصلاح'' کا لفظ استعمال کرنے میں ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس میں عاجزی، انکساری اور عبدیت کا اظہار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ '' انقلاب'' کے لفظ کی ادائیگی ہی سے ہمارے لہجوں میں سختی، رعونت، رعب اور فخر پیدا ہو جاتا ہے۔

## جواب:

ہمارے نزدیک اختلافِ تسمیہ کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے جبکہ علماء کا اصول **لا مشاحة فی الاصطلاح** معروف ہے، اور یہ اختلاف ذوق لطیف کے لیے ضروری بھی ہے۔ آخر پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا بھی ایک خاص مزہ ہے۔ یہی وجہ ہے لفظ اصلاح مولانا مودودیؒ کی ایک ہی

مستقل اصطلاح نہیں ہے۔مولانا کے تخلیق کردہ ادب کا ہر قاری جانتا ہے کہ مولانا نے اسلام کے غلبے کے لیے کئی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ان میں سے چند اہم اصطلاحات یہ ہیں: خلافت الٰہیہ،حکومت الٰہیہ،خدائی بادشاہت،نظام اسلامی،اعلائے کلمۃ الحق،اعلائے کلمۃ اللہ،تجدید دین،احیائے دین،اسلامی انقلاب،اسلامی تحریک،اقامت دین،شہادت حق،تحریک اسلامی،اصلاح،انقلابِ امامت،اصلاحی انقلاب وغیرہ۔مولانا نے اپنے مضمون اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے، میں اصلاح کا لفظ ایک آدھ بار جب کہ انقلاب کا لفظ ایک درجن سے زائد بار استعمال کیا ہے۔(ملاحظہ فرمایئے،تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم،زیر عنوان اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے،صفحہ ۱۶۱ تا ۱۹۰)۔اب کیا جناب رشید صاحب اپنے الفاظ کی لاج رکھتے ہوئے کہ''جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے'' مولانا مودودیؒ کی ذات گرامی پر ان ناپسندیدہ القاب کی تہمت لگانے کی جسارت کریں گے؟

تنظیمِ اسلامی بھی غلبہ 'دین کے لیے صرف انقلاب کی اصطلاح استعمال نہیں کرتی۔بانی 'تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے اپنے ایک اہم مضمون اسلامی انقلاب،معنی ومفہوم اور اس کے لیے قرآنی و دیگر اصطلاحات (شائع شدہ،نوائے وقت و میثاق نومبر ۱۹۹۲) میں اضافی طور پر،تکبیر رب،غلبہ دینِ حق (اظہار دین حق،ماخوذ از التوبہ ۳۳)،دین کا بالکلیہ اللہ کے لیے ہوجانا (ماخوذ از الانفال ۳۹)،قیام عدل وقسط (ماخوذ از الحدید:۲۵) وغیرہ بھی بیان کی ہیں۔

مولانا مودودیؒ اپنی ایک تحریر میں تین اصطلاحات،اقامت دین،شہادت علی الناس اور تحریک اسلامی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''پہلے دو لفظ قرآن سے ماخوذ ہیں اور تیسرا لفظ عام فہم ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ان الفاظ پر اگر کسی نے ناک بھوں چڑھائی ہے تو اس لیے کہ انہوں نے ہماری اصطلاح سے اپنا مفہوم مراد لے لیا ہے،ہمارا مفہوم مراد لیتے تو امید نہ تھی اس پر ناراض ہوتے''۔(جماعت اسلامی کا مقصد،تاریخ اور لائحہ عمل،صفحہ ۸)

بالکل اسی طرح ہم لفظ انقلاب کو آسان فہم ہونے کے سبب استعمال کرتے ہیں۔ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ دینی فرائض اور اِن کے لوازم کے تحت لکھتے ہیں:

> ''اس ضمن میں تین باتیں تو بنیادی واساسی ہیں اور تین ہی ان کے لوازم ہیں۔یہ کُل چھ باتیں ہوں گی۔ تین بنیادی واساسی باتوں کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ ابتداءً بھاری بھرکم اصطلاحات سے ہٹ کر ان کو عام فہم انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ہر علم اور ہر فن کا اصل اور حقیقی فہم انہی اصطلاحات کے حوالے سے حاصل ہوتا ہے۔آپ فزکس

نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کی گرفت میں اس کی بنیادی اصطلاحات' (basic terminologies) نہ آ جائیں۔ اسی طرح ہمارے دین کی بھی اصطلاحات ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ پہلے ان اصطلاحات سے ذرا ہٹ کر بات اصولاً سمجھ لی جائے۔

ان تین بنیادی و اساسی باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود دین پر عمل پیرا ہوں' اس پر کاربند ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ہم دین کو پھیلائیں۔ اور تیسری یہ کہ ہم دین کو قائم کریں۔ یہ ہیں تین بنیادی و اساسی باتیں۔ اب ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ بھی سمجھ لیجیے۔۔۔۔۔۔'' ۔(فرائض دینی کا جامع تصور صفحہ ۴)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے دینی فرائض کو آسان اصطلاحات میں بیان کرنے کے بعد ہر ایک کے لیے قرآن وحدیث کے حوالوں کے ساتھ ایک سے زیادہ دینی اصطلاحات استعمال کر کے بات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اللہ جانے ہم نے دین کی کتنی عظیم اصطلاحات کو بدنام کر چھوڑا ہے۔ لیکن اس وجہ سے ہم دین کی کسی بھی اصطلاح کو اِن شاءاللہ ترک نہیں کریں گے' بلکہ ان میں اصل روح پھونکنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے'' ۔(فرائض دینی کا جامع تصور صفحہ ۲۹)

اب اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے دینی اصطلاحات کو ترک کبھی نہیں کیا بلکہ ابتدائی مرحلے میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے بھاری اصطلاحات سے قطع نظر کرتے ہوئے، آسان یا رائج اصطلاحات میں بات کی ہے اور پھر اصل اصطلاحات کے حوالے سے بھی بات کی ہے۔ مثلاً انقلاب ہی کو لیں جسے ہم اسلامی حکومت یا قیامِ نظامِ اسلامی کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ، دیگر دینی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں جن کا ذکر پیچھے گزر چکا۔

صاحبِ مضمون کی تحریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انقلاب کی اصطلاح کا استعمال طریق انبیائے کرامؑ کے برعکس کوئی چیز ہے اور انبیائے کرامؑ، عبدیت، تقویٰ اور اصلاح کا نعرہ بلند کرتے تھے۔ جہاں تک عبدیت اور تقویٰ کی اصطلاحات کا ذکر ہے تو ہمیں یقین ہے کہ موصوف کی نظر سے تنظیم اسلامی کے دعوتی وتربیتی لٹریچر کا ایک ابتدائی قاعدہ ''فرائض دینی کا جامع تصور'' ضرور گزرا ہوگا۔ وہ اِس میں عبدیت اور تقویٰ کے ساتھ کم ازکم دس مزید اصطلاحات بھی موجود پائیں گے جن کے ذریعے دعوت اسلامی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور جو قرآن وحدیث کی نصوص سے منصوص کی گئی ہیں۔ البتہ قرآن پاک میں اصلاح کا لفظ شعیبؑ کے قول کے طور پر (الاعراف: ۸۵، ہود ۸۸) جبکہ ایک مقام (الاعراف: ۵۶) میں خطابِ الٰہی کے طور پر نقل ہوا ہے۔ البتہ نبی اکرم ﷺ کے لیے یا کسی اور نبی کے لیے یہ لفظ استعمال ہی نہیں ہوا۔ امت محمدی سے خطاب کے ضمن میں اِس مصدر کے بہت سارے مشتقات ضرور

استعمال ہوئے ہیں لیکن ان میں سے کسی جگہ بھی اجتماعی اصلاح، انقلاب، یا اسلامی حکومت یا قانون کے قیام ونفاذ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ کئی جگہ تو یہ لفظ کسی شخص کی توبہ کے بعد پرہیزگاری اور کئی جگہ مختلف فریقین کے مابین صلح کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے علم کی حد تک نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں یہ لفظ اپنے لیے استعمال نہیں فرمایا۔ اب سوچا جاسکتا ہے کہ جب قرآن میں یہ لفظ صرف ایک نبیؑ کے لیے استعمال ہوا ہے تو اس کے استعمال پر اصرارِ شدید اور ترک پر اعتراضِ زجر وتوبیخ کتنا مناسب ہے؟ پھر ہمارے دین میں کئی اصطلاحات ایسی ہیں جو دورِ نبوی ﷺ میں موجود نہ تھیں لیکن بعد کے علماء نے عصری علمی ضروریات کے تحت انہیں رائج کیا۔ بطور مثال سنت مؤکدہ، مکروہ تنزیہی، مکروہ تحریمی وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

الحمدللہ! اصلاح کے لفظ کو استعمال کرنے پر ہمیں نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ ہی اِس پر ہم کوئی شرم محسوس کرتے ہیں بلکہ چونکہ قرآنِ حکیم میں ایک جلیل القدر نبیؑ سے اس لفظ کا استعمال ثابت ہے، لہٰذا دیگر اصطلاحات کے ساتھ ''اصلاح'' کو ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ رائج الوقت اردو محاورے میں اس لفظ کا غالب استعمال انفرادی اصلاح کے لیے رائج ہے۔ لہٰذا ہمیں اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے اس کے ساتھ انفرادی یا اجتماعی کا سابقہ لگانا چاہیے یعنی انفرادی اور اجتماعی اصلاح۔ اس لفظ کو بطور اصطلاح استعمال کرنے کے باوجود مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

> ''ہماری زبانوں پر جب کبھی اصلاح کا نام آیا ہے تو ذہن معاً چھوٹی برائیوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور پھر ہر نشترِ اصلاح اسی پرانے مذاق کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ اب آپ لوگ اس مذاق کو یکسر بدل ڈالیے''۔ (ہماری تبلیغی پالیسی، روداد جماعت اسلامی، حصہ دوم، صفحہ ۳۷)

جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ لفظ اصلاح میں عاجزی، انکساری اور عبدیت کا اظہار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ ''انقلاب'' کے لفظ کی ادائیگی ہی سے ہمارے لہجوں میں سختی، رعونت، رعب اور فخر پیدا ہوجاتا ہے۔ غور فرمائیے بعض دفعہ اچھے ناموں کی پشت پر برے تصورات بھی پائے جاتے ہیں مثلاً دورِ نبوی ﷺ میں منافقین اصلاح کا لفظ استعمال کرکے فساد مچایا کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالی ہے {وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ}۔ جدید دنیا میں رونما ہونے والا اکثر فساد، بعنوان اصلاح یا دیگر اچھے الفاظ ہی سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ یورپ کی تحریک اصلاحِ مذہب اس کی نمایاں مثال ہے۔ عصر حاضر کے بعض متجددین اور ماضی قریب کے بعض مناظرین، تجدید واجتہاد کے نام پر دین کی جو درگت بنانے کی سعی نامراد کرچکے ہیں وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ لہٰذا اہمیت صرف اصطلاح کی نہیں بلکہ پس پردہ اور پیش نظر مقاصد کی بھی ہے۔ اگر اصلاح کا لفظ استعمال

کرنے والے انفرادی تربیت وتزکیہ کے ساتھ ساتھ نظام حکومت، کاروباری اداروں، معاشی سرگرمیوں، عائلی قوانین، فوجداری قوانین، کی اصلاح بھی چاہتے ہیں تو ہمارے نزدیک لفظ اصلاح کا استعمال محمود ہے اور اسے ہی ہم انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں (جاری ہے)

عالم اسلام　　بی بی سی لندن

# افریقہ میں مسلمانوں کی نسل کشی

بی بی سی لندن کی یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ افریقہ سے کس طرح مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کی کوششیں ہورہی ہیں (اگرچہ بروزن بیت مسلمان 'انتہا پسند' گروہوں کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے)۔ ہماری بے بسی اور نالائقی کی انتہا یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی ادارہ نہیں جو مسلم امہ کے صحیح حالات ہم تک پہنچائے اور کوئی ایسا ادارہ نہیں جو حالات کی اصلاح کے لیے کوئی کوشش کرے۔ اسلام اور مسلم دشمنوں نے ہماری قیادتوں کو افیون پلا کر سلا رکھا ہے اور ہم بے حسی کے ہلکوروں میں مست ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پہ رحم فرمائے اور ہمیں احتساب نفس اور اپنی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین (ادارہ)

انسانی حقوق کے علم بردار ایک بین الاقوامی گروپ کا کہنا ہے کہ وسط افریقی ریاست میں عالمی امن فوج مسلمانوں کی نسلی تطہیر روکنے میں بری طرح ناکام ہوگئی ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ وسط افریقی ریاست میں پے در پے مظالم کے باعث مسلمان اتنے بڑے پیمانے پر انخلا کررہے ہیں کہ اسے آسانی سے تاریخی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ملک میں چونکہ تھوک اور پرچون کا دھندا بہت حد تک مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، اس لیے معاشی حالات کی خرابی کے باعث اب خوراک کا شدید بحران پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے ورلڈ فوڈ پروگرام نے اب طیاروں سے خوراک پہنچانا شروع کی ہے۔ یہ منصوبہ ایک ماہ تک جاری رہے گا۔ ورلڈ فوڈ پروگرام کے ترجمان الیگسز مسکیریلی نے بی بی سی کو بتایا کہ سڑک کے راستے خوراک پہنچانا انتہائی خطرناک ہے، اس لیے خوراک گرانے کا آپشن اپنایا گیا ہے۔ خوراک پہنچانے کے پروگرام پر زیادہ رقم خرچ ہورہی ہے اور یہ پروگرام پڑوسی ملک کیمرون کے تعاون سے شروع کیا گیا ہے، جس نے لاجسٹک سپورٹ فراہم کی ہے۔ پہلی کھیپ ۸۲ ٹن چاول کی تھی، جس کے بعد ۱۸۰۰ ٹن دلیہ پہنچایا گیا۔ بڑے پیمانے پر خوراک کی فراہمی جاری رہے گی تاکہ کوئی بڑا انسانی المیہ رونما نہ

ہو۔

اب تک جتنی خوراک پہنچائی گئی ہے، وہ ڈیڑھ لاکھ افراد کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی تھی جب کہ پورے ملک میں مجموعی طور پر بارہ لاکھ پچاس ہزار سے زائد بے گھر افراد کو خوراک پہنچانا ناگزیر ہے کیونکہ ان کے پاس خوراک حاصل کرنے کے ذرائع انتہائی محدود ہو چلے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ذرائع نے بتایا ہے کہ بحران سے دو چار ہونے والے افراد میں ۹۰ فیصد صرف ایک وقت کا کھانا حاصل کر پا رہے ہیں۔ دارالحکومت بانگونی سے بیشتر مسلم تاجر نقل مکانی کر گئے ہیں، جس کے باعث خوراک کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

دارالحکومت کے مختلف علاقوں سے نقل مکانی کر کے ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں نے بانگونی ہوائی اڈے پر پناہ لے رکھی ہے۔ ترجیحی بنیاد پر انہیں خوراک فراہم کی جائے گی۔ ملک بھر میں لوگوں نے مساجد، گرجوں اور اسکولوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ انہیں بھی ترجیحی بنیاد پر خوراک دی جائے گی۔

وسط افریقی ریاست میں ایک سال سے بھی زائد مدت سے سیاسی بحران چل رہا ہے، جو اب غیر معمولی شدت اختیار کر چکا ہے۔ فرانس نے امن فوج کے لیے ایک ہزار چھ سو اور افریقی ممالک نے مل کر ساڑھے پانچ ہزار فوجی فراہم کیے ہیں۔ فرانس کے وزیر دفاع ژاں ویزلے دریاں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے گزشتہ ہفتے وسط افریقی ریاست کے دارالحکومت بانگونی کا دورہ کیا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بان کی مون نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ملک مسلم اور عیسائی علاقوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ ایک بیان میں بانکی مون نے کہا کہ مسلم اور عیسائی دونوں ہی منظم طریقے سے، بڑے پیمانے پر قتل کیے گئے ہیں تاکہ بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہو۔ ملک کا باضابطہ جغرافیائی طور پر منقسم ہونا تو دور کی بات لگتا ہے مگر حالات نے بڑے پیمانے پر آبادیوں کی نقل مکانی کو ایک تلخ حقیقت بنا دیا ہے۔

وسط افریقی ریاست میں گزشتہ سال مسلم باغی فورس ''سلیکا'' نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا، جس کے باعث مبینہ طور پر عیسائیوں کو قتل کیا گیا اور بڑے پیمانے پر زیادتی کے واقعات بھی ہوئے۔ 'سلیکا' گروپ نے جنوری میں اقتدار چھوڑ دیا تھا مگر اس کے باوجود عیسائیوں نے مختلف گروپوں کی شکل میں اب تک مسلمانوں سے انتقام لینا ترک نہیں کیا ہے اور ملک بھر میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بتایا ہے کہ بعض علاقوں میں امن فوج نے بھی تشدد کو راہ دی ہے۔ ''سلیکا'' کے دستبردار ہونے سے طاقت کا جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے پُر کرنے کے لیے عیسائی گروپوں کو کھل کر من مانی کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ ایمنسٹی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انٹی بلاکا (عیسائی) گروپوں کو کنٹرول کیا جائے اور ان علاقوں میں امن فوج کے مزید دستے تعینات کیے جائیں، جہاں مسلمانوں کو مسلسل دھمکایا جا رہا ہے۔ وسط افریقی ریاست میں فرانسیسی مشن کے سربراہ جنرل فرانسسکو

سوریا تو نے کہا ہے کہ انٹی بلاکا فورسز امن کی دشمن ہیں۔ایمنسٹی نے یہ بھی بتایا ہے کہ دارالحکومت بانگوئی سے فرار ہوجانے کے بعد بھی مسلم سلیکا ملیشیا کے ارکان عیسائیوں پر حملے کررہے ہیں۔ایمنسٹی میں سینئر کرائسز ریسپانس ایڈوائزر جوان میرنر کا کہنا ہے کہ وسط افریقی ریاست میں صورت حال توجہ کا تقاضا کر رہی ہے۔ان کے خیال میں امن فوج کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے۔ایک طرف تو اسے امن برقرار رکھنا ہے، ساتھ ہی ساتھ زیادہ حساس اداروں میں لوگوں کو تحفظ دینا ہے اور مختلف علاقوں سے بڑے پیمانے پر آبادی کا انخلا روکنا ہے۔

**مغربی تہذیب**　　ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری☆

# لبرل ازم کیا ہے؟

لبرل ازم سرمایہ دارانہ نظام زندگی کو وہ نظریاتی جواز فراہم کرتا ہے جو تاریخی طور پر سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی یورپ میں چودہویں صدی عیسوی سے رائج ہونا شروع ہوا۔اِس نظامِ زندگی کی توجیہ ان عیسائی مفکرین نے کی جو پوپ اور کیتھولک ازم (Catholicism) کے باغی تھے لیکن یہ توجیہات سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے فروغ اور استحکام کے لیے زیادہ کارآمد نہ ہوسکیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں جو غیر کیتھولک ریاستیں یورپ میں قائم ہوئیں وہ مذہبی ریاستیں تھیں اور انہوں نے سرمایہ دارانہ نظم معاشرت کے فروغ کی راہ میں مختلف پابندیاں عاید کیں۔ان مذہبی ریاستوں کے خلاف سرمایہ دارانہ حلقوں نے جو بغاوت برپا کی وہ لبرل ازم ہے۔لبرل ازم کا بانی مفکر جان لاک (John Locke) ہے۔میری رائے میں لبرل ازم کی پانچ صدیوں کی تاریخ میں اس سے زیادہ مؤثر مفکر پیدا نہیں ہوا۔یہ اتنا صاحب اثر مفکر ہے کہ اس نے دورِ حاضر کی اسلامی فکر کو بھی متاثر کیا ہے اور بیسویں صدی کے ایک اہم اسلامی سیاسی مفکر مولانا مودودیؒ جان لاک کے کلیدی تصورات کی اسلام کاری اپنی کتابوں مثلاً ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' اور ''خلافت وملوکیت'' میں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جان لاک اس عیسائی ریاست کا باغی تھا جو کرامویل (Oliver Cromwell) نے سترہویں صدی کے وسط میں برطانیہ میں قائم کی تھی جو لگ بھگ چالیس سال تک قائم رہی۔لاک کی اہم ترین کتاب ''*The Second Treatise on Government*'' ہے اور اس کتاب میں لبرل انفرادیت، معاشرت اور ریاست کے جو تصورات پیش کیے گئے ہیں لبرل مفکرین پچھلے پانچ سو سال سے ان کی تشریح اور تفصیل ہی بیان کررہے ہیں۔ان تصورات کی فلسفیانہ توجیہ اگلی صدی میں فرانس کے روسو (Rousseau) اور جرمنی کے کانٹ (Immanuel Kant) نے کی اور اٹھارہویں صدی میں اس فکر کی

بنیاد پر امریکا اور فرانس میں کامیاب سیاسی انقلاب برپا کیے گئے۔ اٹھارہویں صدی کے یورپ میں لبرل ازم کی مربوط اور منظم فکری مزاحمت نظر نہیں آتی اور عیسائی سیاسی تصورات لبرل مباحث میں ضم ہوتے نظر آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس (Marx) اور نطشے (Nietzsche) لبرل ازم کے اہم فکری مخالفین کے طور پر ابھرے اور انہوں نے اشتراکیت اور قوم پرستی کو سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے فروغ کے لیے زیادہ سازگار نظریات

-----------------------------------------------

☆ دانشور، محقق، استاد، ماہر اقتصادیات، کراچی

کے طور پر پیش کیا۔ اشتراکیت اور قوم پرستی کامیاب عوامی تحریکیں برپا کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور جرمنی، جاپان، روس اور چین میں قوم پرست اور اشتراکی ریاستیں قائم ہوگئیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے فروغ اور استحکام کے لیے یہ اتنی مفید ثابت نہ ہوسکیں جتنی لبرل ریاستیں۔ عیسائی فکر کی طرح قوم پرستانہ اور اشتراکی فکر بھی بتدریج لبرل مباحث میں ضم ہوتی چلی گئی۔ بیسویں صدی سے لبرل ازم کو دو دیگر سرمایہ دارانہ نظریات یعنی مابعد استعماریت (Post Colonialism) اور مابعد جدیدیت یا پوسٹ ماڈرنزم (Post Modernism) کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا۔ فکری سطح پر مابعد استعماریت کے چیلنج کو امریکی مفکرین جان رالز (John Rawls) اور تھامس اینجلز (Thomas Angel) نے لغو (Incoherent) ثابت کیا اور پوسٹ ماڈرنزم کا حتمی ورژن جرمن مفکرین ہیبر ماس (Habermas) اور گیڈمور (Gadamor) نے مرتب کیا۔ مابعد جدیدیت اور مابعد استعماریت ان معنوں میں ناکام تحریکیں ہیں کہ وہ سرمایہ کی مسلسل بڑھوتری کے لیے لبرل ازم سے بہتر معاشرتی اور ریاستی اداراتی صف بندی کے تصورات پیش کرنے سے قاصر رہیں لیکن ان معنوں میں یہ تحریکیں کامیاب رہیں کہ انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے ایسے تضادات کی نشاندہی کی جنہیں رفع کرنے کی استطاعت لبرل نظریات نہیں رکھتے۔

لبرل نظام فکر ان معنوں میں یقیناً ایک بحران کا سامنا کررہا ہے کہ اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ لبرل اہداف یعنی ''آزادی'' اور ''ترقی'' ناقابل حصول اہداف ہیں لیکن یہ بات صرف منطقی اور فکری سطح پر واضح ہوئی ہے اور کوئی بھی لبرل مفکر آج یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ لامحدود ترقی اور آزادی قابل حصول اہداف ہیں (یہ بات سب سے واضح طور پر ان مباحث میں پائی جاتی ہے جن کی ابتدا ہائیڈیگر (Heidegger) نے کی اور جو آج کل (Complexity Theory) کہلاتی ہے) اور یہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی شکست وریخت کا ایک مظہر ہے کیوں کہ آزادی اور ترقی صرف لبرل ازم کے اہداف نہیں وہ

قوم پرستی اوراشتراکیت کے بھی اہداف ہیں۔لبرل ازم،اشتراکیت اورقوم پرستی کی لغویت کا اظہار سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی بتدریج شکست وریخت کا ایک مظہر ہے لیکن جیسا کہ Alain Isadion اور Slavoj Zizek واضح کرتے ہیں کہ ابھی یہ بات بالکل عیاں نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظامِ حیات کا متبادل کیا ہے؟ Zizek کہتا ہے کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہ ایک Liminal دور ہے۔ یہ واضح ہوگیا ہے کہ آزادی اورترقی غیرمعقول اورلغواہداف ہیں لیکن انسانوں کی بہت بڑی اکثریت انہی نامعقول اورلغواہداف پر ایمان رکھتی ہے اورررائے عامہ کومتاثر کرنے والے تمام مباحث (Policy discourses) انہی اہداف کے حصول کی حکمت عملیاں ترتیب دیتے نظر آتے ہیں۔کوئی بھی سرمایہ دارانہ مخالف مزاحمتی تحریک آزادی اورترقی کے اہداف کو واضح طور پر رد نہیں کرتی بلکہ اپنی مزاحمت کوحصول آزادی اورترقی کا ذریعہ گردانتی ہے۔ان حالات میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا متبادل کیا ہوگا اور کتنی صدیوں تک گومگو کی یہ کیفیت جاری رہے گی؟ اسلامی تحریکوں میں یہ رائے عام ہے کہ آنے والا نظام اسلام ہی ہوگا لیکن لگتا تو ایسا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے ظہور میں ابھی کئی ہزار سال کا وقفہ باقی ہے۔آج تحفظ دین اورغلبۂ دین کی جدوجہد نہایت منتشر،غیرمربوط اورسست روی کا شکار ہے۔اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد محدود ہے اورنومسلموں کی عظیم اکثریت مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی طرح سرمایہ دارانہ نظام زندگی کورَد کرنے کی نہ استطاعت رکھتی ہے اور نہ خواہش۔علما اورصوفیا فرقہ وارانہ جھگڑوں میں بری طرح پھنسے ہوئے اورغلبۂ دین کی جدوجہد سے قطعاً لاتعلق ہیں۔اسلامی تحریکیں سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کا جزو لاینفک بنی ہوئی ہیں اورایران،سوڈان،مصر وغیرہ میں جو اسلامی حکومتیں قائم ہوئی ہیں ان سب نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ان ریاستوں کوعوامی پذیرائی حاصل نہیں اورمجاہدین اسلام عوامی مقبولیت حاصل کرنے کی کوئی جدوجہد مرتب کرنے کے خاص قائل نہیں۔ان کا رویہ تو اس شعر سے عیاں ہے
؎

راہِ خدا کے متوالے ہیں اس سے بالکل بے پرواہیں
کون ہے راضی کون خفا ہے،زنداں زنداں مقتل مقتل

اس طرح جہاد جاری تو صدیوں تک رہ سکتا ہے لیکن اس جہاد کے ذریعے توسیع پذیر نظام قائم نہیں کیا جاسکتا۔ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ مستقبل قریب میں ہمیں عالمی نظاماتی غلبہ حاصل ہوگا خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ یقیناً ممکن ہے کہ اسلام علمی لحاظ سے سرمایہ دارانہ نظام کے عالمی متبادل کے طور پر اُبھرے لیکن یہ کافی نہیں۔سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمیں ایک طویل مدتی منصوبہ بند جدوجہد کرنا

پڑے گی۔

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اس جدوجہد کی ابتداء سرمایہ دارانہ نظریات سے اچھی طرح واقفیت پر منحصر ہے۔ ذیل میں لبرل تصورات کی تشریح کرنے کی کوشش کروں گا۔ (جاری ہے)

اسلام اور پاکستان

فضل کریم بھٹی ☆

# پاکستان میں برٹش کلچر کا غلبہ

## اسباب اور علاج

پاکستان ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔ یہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی طویل جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ اس کے قیام کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان تقریباً ایک ہزار سال سے مسلمان بادشاہت کے زیر سایہ زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ بادشاہ مطلق العنان تھے لیکن ملک کا قانون شریعت پر قائم تھا۔ سیاسی معاملات میں بادشاہ عموماً بدعنوانی کرتے تھے لیکن پھر بھی مسلمانوں کو اہل وطن ہندوؤں پر بالادستی حاصل تھی۔ مغلیہ سلطنت کے بعد جب انگریز کی عمل داری شروع ہوئی تو انگریز نے سلطنت مغلیہ کے زمانے کا نظامِ تعلیم ختم کر دیا اور اپنا نظامِ تعلیم قائم کیا۔ پرانا نظامِ تعلیم مسلمان علماء کے ہاتھ میں تھا جو ختم ہو گیا۔

مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی یلغار سے بچانے کے لیے علماء نے محسوس کیا کہ مغربی تعلیم مسلمانوں کے لیے بہت نقصان دِہ ہے اس لیے انہوں نے اپنا پرانا نصاب تعلیم جاری رکھا۔ نئے بدلے ہوئے حالات کے لیے نئے نصاب کی ضرورت تھی تاکہ مسلمانوں کی مذہبی عبادات اور معاملات کی ضروریات بھی پوری ہوں اور وہ وقت اور زمانے کی ضروریات پوری کر سکیں مگر علماء جامد تقلید کے عادی تھے اِس لیے انہوں نے ۱۸۶۶ء میں مدرسۂ دیوبند میں درسِ نظامی ہی جاری رکھا۔ درسِ نظامی مُلّا نظام الدین فرنگی محلی متوفی

۱۷۴۶ء نے تیار کیا تھا جو اپنے وقت میں بہترین نصابِ تعلیم تھا لیکن اب اپنی افادیت کھو بیٹھا تھا۔ بہرحال علماء پرانے نصابِ اسلامی پر جم گئے اور ابھی تک اُسی پر جمے ہوئے ہیں۔ جب مسلمان انگریز کی عمل داری میں زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں پسماندہ رہ گئے تو بعض اہل فکر و نظر مسلم زعماء نے مغربی علوم و فنون کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے سرسید احمد خاں کی سرکردگی میں علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا اور اسلامیہ سکول قائم کیے۔ اس طرح ہماری تعلیم میں ثنویت یا دوئی پیدا ہوئی جو ابھی تک قائم ہے۔

نظام تعلیم کی ثنویت نے ہمیں بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ پرانا نظام تعلیم جو دینی مدرسے کہلاتا ہے، جدید علم و فنون سے کورا ہے اور جدید درس گاہیں اسلامی علوم و فنون کی تسلی بخش تعلیم نہیں دے رہیں۔ جدید درسگاہوں پر سیکولر علوم فنون کا غلبہ تھا جو علومِ اسلامی کے داخل کرنے سے کم نہیں ہوا۔ جب تک ہم میں تعلیمی ثنویت ختم نہیں ہوتی ہم ایک متفرق اور منقسم گروہ ہی رہیں گے، ایک قوم نہیں بن سکتے۔ ہم میں یک سوئی اور یک رنگی پیدا نہیں ہوگی، ہم اپنی پسماندگی دُور نہیں کر سکیں گے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل نہیں کر سکیں گے۔

روایت پرست علماء چونکہ جدید علوم و فنون سے نابلد ہیں اس لیے قوم کی اکثریت کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں شروع سے دردمند اہل دِل مسلمان دانشوروں نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ قدیم یونانی علوم و فنون کی جگہ جدید علوم و فنون سیکھ کر عوام کی رہنمائی کریں لیکن اُن کی نفسیات یہ ہے کہ وہ اس طرف نہیں آتے۔ وہ صاف فرماتے ہیں کہ ہم قرآن و حدیث جانتے ہیں ہمیں کسی اور علم کی ضرورت نہیں۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور کرو اور حکمت پر زور دیتا ہے وہ حکمت ہم گم کر بیٹھے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو فاضلین مدرسوں سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں جن کے لیے کوئی روزگار نہیں۔ وہ تعلیم حاصل کر کے جب مسجدوں اور مدرسوں کا رُخ کرتے ہیں تو وہاں نہیں پیش امام اور خطیب کی ملازم میسر نہیں ہوتی تو پھر اپنی اپنی مسجدیں بناتے ہیں۔ اس طرح ہر گلی محلے میں تین تین چار چار مسجدیں بن جاتی ہیں پھر فرقہ بندی پر دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں اور قوم تقسیم در تقسیم ہوتی ہے۔ انتہا پسندی اور شدت پسندی پروان چڑھتی ہے اور پھر دہشت گردی دہشت پھیلاتی ہے جس کا ازالہ جامع اسلامی نظامِ تعلیم ہی سے ہوسکتا ہے۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو علم و حکمت سے لبریز ہے۔ ہم اسے بغیر سمجھے ناظرہ پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ہم قرآن حفظ کرتے ہیں لیکن بغیر سمجھے حالانکہ جو شخص قرآن حفظ کرتا ہے وہ غیر معمولی انسان ہوتا

---

☆ مکان نمبر ۶۰۸۔ سٹریٹ نمبر ۱۴، سیکٹر اے، عسکری ۱۴۔ راولپنڈی

ہے اور وہ بغیر سمجھے ساری عمر قرآن مجید پڑھتا اور سناتا رہتا ہے۔ ایسے حفاظ ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں ہیں جو رمضان میں قرآن سنانے کے بعد سارا سال چھوٹے موٹے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر ایسے حفاظ کو دینی اور عمرانی علوم پر اعلیٰ تعلیم دلا کر سکولوں اور کالجوں میں ٹیچر رکھ لیا جائے تو وہ معاشرے کے لیے بہت مفید ہوں گے۔ اگر یہ حفاظ خود پانچ سات مہینے لگا کر عربی لغت اور گرائمر یا صرف نحو سیکھ لیں تو قرآن کو سمجھ کر پڑھ سکیں گے اور خود قرآن سے پورا پورا فیض حاصل کریں گے۔

## نظام تعلیم کی اصلاح شدت پسندی اور دہشت گردی کو ختم کرنے کی کلید ہے

اگر ہم نظام تعلیم کی اصلاح کر لیں۔ دینی تعلیم کا خاطر خواہ اور تسلی بخش انتظام سکولوں اور یونیورسٹیوں میں کر لیں۔ یونیورسٹیوں سے پیش امام، خطیب اور علماء دین تیار کریں تو ہماری سوسائٹی میں مسٹر اور مولوی کی تقسیم ختم ہو جائے گی۔ قوم میں یک سوئی اور یک رنگی پیدا ہوگی۔ درسِ نظامی کے مدرسوں کی بجائے وہاں کے طالب علم یونیورسٹیوں کی طرف لانے کے لیے وظائف اور دیگر سہولیات دینی چاہئیں۔ اس طرح ہم میں شدت پسندی اور دہشت گردی ختم ہو جانے کی امید ہے۔

## برٹش کلچر کا غلبہ اور اُس کا سدباب

انگریز نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا اُس وقت مسلمان انحطاط اور زوال کی آخری سرحدوں کو پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان اُمرا نے شہنشاہ ہند کو شاہِ شطرنج بنا رکھا تھا۔ مسلمان اُمرا میں ایرانی اور تورانی کی تقسیم شدت اختیار کر گئی تھی یہ اصل میں شیعہ سنی تفریق تھی۔ اِن اُمرا کو خودغرض اور ہوسِ اقتدار نے اندھا کر دیا تھا۔ یہ خودغرضی میں اتنے اندھے تھے کہ اِن سے فہم و فراست، علم و حکمت اور حالات کی بصیرت رخصت ہو گئی تھی۔ اِن میں کفر و اسلام کا تصور ختم ہو چکا تھا اور یہ صرف اپنی ذات اور مفاد پرستی کا سوچتے تھے۔ اسلام کا نظام اعلیٰ و ارفع آفاقی اصولوں پر قائم ہے یہ اُس کو بھلا بیٹھے تھے۔ بادشاہ کو اپنے ذاتی فوائد کے لیے استعمال کرتے۔ یہ نام مذہب کا لیتے لیکن باتیں بڑے بڑے اصولوں کی کرتے تھے لیکن اعمال گھٹیا تھے۔ انہوں نے اسلام کو اپنے اپنے تنگ دامنوں میں فرقوں کے نام پر گھیرا ہوا تھا۔ آخر ہندوؤں کی قومیں جیسے مرہٹے، جاٹ اور سکھ طاقت ور ہو گئے اور یہ اُن کے دست نگر ہو گئے، آخر ملک گنوا بیٹھے۔

انگریز نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو سلطنت مغلیہ کے پرانے ملازم اور اہل کار فارغ کیے گئے۔ فوج، انتظامیہ اور عدلیہ کو ختم کیا اور اپنا نظامِ حکومت قائم کیا۔ سب حکمرانوں کی طرح اپنے ڈھنگ اور کام کے لوگوں کو اپنی ملازمت میں لیا۔ اپنے وفادار قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں سے خوب کام لیا۔ اُن کو نوازا اور اپنے نئے وفاداروں کو جاگیریں دیں، زمینیں دیں، وظیفے

دیئے اور خطابات سے نوازا۔ موجودہ پاکستان کے ان لوگوں کو برٹش امپیریلزم کا دست و بازو بنایا۔ اِن لوگوں نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے کوئی کام نہ کیا بلکہ فینس (Fence) یا دیوارِ تقسیم پر بیٹھے رہے جب پاکستان بن گیا تو یہ لوگ اپنے قبائلی اور ذات برادری میں اثر ورسوخ کی وجہ سے ملک کی قانون ساز اسمبلیوں میں پہنچ گئے۔ انہوں نے ملک کی دولت کو خوب لوٹا اور اِس کے بعد اِن کے اخلاف اور اولاد وہاں پہنچ گئی۔ یہ ابھی تک انگریز کے گیت گاتے ہیں اور اپنی قوم کے عوام کو رعیت سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم کے خلاف ہیں اس لیے کہ عوام تعلیم حاصل کر کے اپنے حقوق مانگیں گے۔

برٹش کلچر کا گہرا اثر تو سارے ملک کی اشرافیہ پر ہے لیکن بڑے زمینداروں، جاگیرداروں، فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی پر زیادہ ہے۔ سب سے زیادہ فوج پر ہے۔ انگریز کو رخصت ہوئے چھیاسٹھ سال ہو چکے ہیں۔ ملک میں کوئی انگریز ملازم نہیں لیکن ہم حکومت کی سرکاری زبان انگریزی کو اپنائے ہوئے ہیں حالانکہ ہماری اپنی زبان اُردو ایک ترقی یافتہ زبان ہے جو دوسو سال سے بولی جارہی ہے اور وسیع لٹریچر رکھتی ہے۔ یاد رہے سلطنت مغلیہ کی زبان فارسی تھی۔ دربارِ شاہی اور اعلیٰ طبقے کی زبان فارسی تھی لیکن سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں اُردو وسیع طور پر بولی اور سمجھی جاتی۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر بڑا عمدہ شاعر تھا جس کا اپنا دیوان تھا۔ اُس زبان کو ہم سرکاری زبان نہیں بنا سکے۔ انگریزی زبان کی اپنی افادیت ہے اور وہ بین الاقوامی زبان ہے لیکن قومیں اپنی زبان سے ہی پہچانی جاتی اور ترقی کرتی ہیں۔

آفرینش سے رنگ، نسل، مذہب اور زبان ایک قوم کو متحد کرنے کے ضروری اجزا ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ ملک اسلام کی تجربہ گاہ اور لیبارٹری کے لیے بنایا تھا۔ قائداعظم نے کئی بار فرمایا ہم پاکستان کو اسلام کی لیبارٹری بنائیں گے۔ بدقسمتی سے ہم باتیں تو اسلام کی کرتے ہیں لیکن اسلام کے نظم وضبط کو منظور نہیں کرتے نہ اُس پر عمل کرتے ہیں۔ یہیں سے ہماری منافقت واضح ہو جاتی ہے۔ کوئی قوم مضبوط نہیں ہو سکتی اور نہ ترقی کر سکتی ہے جب تک وہ اپنے فکر ونظر کی پوری طرح پیروی نہ کرے۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام دین اسلام کی صورت میں موجود ہے لیکن ہم اُس پر صدقِ دِل اور خلوصِ نیت سے عمل نہیں کر رہے۔ دوسری طرف ہمارے روایت پرست علماء ہیں وہ ابھی تک قرونِ وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھے۔ جس وقت صحابہ نے دنیا کی دو سپر پاورز کو فتح کیا اُس وقت انہوں نے حق رائے دہی کے اصولوں پر خلافت قائم کی۔ بیعت خاصہ اور پھر بیعت عامہ کے ذریعے خلیفہ کا چناؤ کیا گیا۔ اِس کی مختلف صورتیں تھیں لیکن بیعت عامہ کا مطلب حق رائے دہی تھا۔ اِس کا مطلب ہم یہی سمجھتے آئے ہیں کہ اسلام میں مطلق العنان بادشاہت یا شہنشاہیت نہیں ہے۔ جب دنیا میں بادشاہت قائم تھی اُس وقت خلافت اسلامیہ وجود میں آئی۔ بعد کے ادوار میں بادشاہت کو علماء نے اس لیے برداشت کیا کہ ایک روایت کے

مطابق اگر بادشاہ شریعت پر چلے تو اُس کو برداشت کیا جائے لیکن اسلام میں اصل طرزِ حکمرانی جمہوری ہے جس میں مسلم عوام کی رائے ضروری ہے۔ اسلام کے اہل الرائے یا اہل حل وعقد کی بھی رضا مندی ضروری ہے۔ بہرصورت ہم اپنے شروع اسلام کے اصولِ مشاورت کو بھول چکے ہیں اور اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اسلام میں جمہوریت نہیں۔ مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت یا نظامِ مشاورت سے جوڑنا معقول بات معلوم نہیں ہوتی۔ اصل میں علماء جدید علوم وفنون کی ناواقفیت کی وجہ سے مسلم عوام سے دُور ہو گئے ہیں اِس لیے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو نہیں سمجھتے اور وہ نہ نظامِ مشاورت کو خلافت راشدہ کے بعد عصرِ حاضر کے مطابق پیش کر سکے ہیں حالانکہ اِس نظام کی ہر زمانے کے مطابق تشکیل نو کی جا سکتی ہے۔

ہم میں جو لوگ سیکولر یا لبرل ہیں اُن کو عام طور پر بے دین اور لا دین کہا جاتا ہے۔ وہ اصل میں نادان بھٹکے ہوئے راہی ہیں۔ وہ قدامت پسند علماء کو اُن کی ظاہری بود و باش اور وضع قطع پر زور دینے کی وجہ سے انتہا پسند اور شدت پسند سمجھتے ہیں۔ اصل میں بھٹکے ہوئے راہی کو سیدھے راستے پر لانے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے صحیح اصولوں توحید، رسالت اور آخرت پر زیادہ زور دیا جائے تو سلیم الطبع لوگ جزئیات کو بھی درست کر لیتے ہیں۔ جدید اور قدیم کا بُعد مٹایا جا سکتا ہے۔

برٹش نوآبادیاتی کلچر ہمارے لیے بہت نقصان دہ ہے لیکن اِس سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم میں جدید علوم وفنون سے واقف ایسے دینی علماء درس گاہوں میں تیار ہوں اور وہ سیکولر اور لبرل اہل علم و دانش پر جدید طریقے سے تبلیغ کریں۔ برٹش نوآبادیاتی کلچر کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ برٹش امپیریل سسٹم تھا جہاں افسروں کو آن بان سے رہنا ہوتا تھا۔ اُس کے لیے انہوں نے بہت زیادہ عملہ رکھا ہوتا تھا جس کی جمہوری اور آزاد ملکوں میں ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ امریکہ کے سارے افسران اپنی خط و کتابت خود ٹائپ کرتے اور اپنے کاغذات خود فائل کرتے ہیں بس ایک دو معاون مدد کے لیے رکھ لیتے ہیں۔ برٹش انڈین آرمی نے دیسی فوجیوں کے لیے ایک دیسی افسروں کا مڈل رینک رکھا ہوا تھا جس کو وہ وائسرائے کمشنڈ آفیسر کہتے تھے یا ہندوستانی سردار چونکہ انگریز آفسر فوجی سپاہیوں سے زیادہ ملنا پسند نہیں کرتے تھے ساتھ ہی زبان کا مسئلہ تھا۔ ہماری پانچ لاکھ کی فوج میں وہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں جبکہ ہمارے افسروں کو اُن کی ضرورت نہیں ہے وہ اُن کی زبان سمجھتے ہیں، اُن کی عادات سمجھتے ہیں لیکن فوج کے افسر برٹش امپریل کلچر سے باہر نہیں آ سکے۔ ہمارے سول کے حکمران بھی اُس کلچر سے باہر نہیں آ رہے۔ فوج کے مڈل رینک کو ختم کر دینا چاہیے جس سے کروڑوں روپے بلکہ اربوں روپے ہر سال بچیں گے۔ بیوروکریسی اور جوڈیشری بھی نوآبادیاتی نظام سے باہر آئے۔ اِس کو ختم کرنے کے لیے اسلامی اور قومی فکر و نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے علماء اِن ساری چیزوں کو نہیں سمجھتے وہ اِن سب چیزوں سے بے خبر ہیں۔ یہ وہی کر سکتے ہیں جو دردِ دل رکھتے ہوں۔ اسلامی اور

قومی نظام اور عصر حاضر کو سمجھتے ہوں اور پختہ ایمان ویقین رکھتے ہوں۔

## حرف آخر

میری تلخ نوائی کو معاف کیا جائے اور اُن تجاویز پر سنجیدگی سے غور کیا جائے جو میں نے پیش کی ہیں۔ دینی تعلیم کو جدید علوم وفنون سے ہم آہنگ کیا جائے۔ علم تو مومن کی گم کردہ میراث ہے اِسے جہاں سے مل سکے حاصل کیا جائے۔ آخر ہمارے بزرگ علماء اور اہل علم ودانش نے یونانی علوم وفنون حاصل کیے جن کو ہم ابھی تک پڑھ رہے ہیں۔ کیا حکیم افلاطون، ارسطو، بقراط اور سقراط مسلمان تھے جن کے فلسفے، منطق اور طب کی کتابیں ابھی تک پڑھ رہے ہیں؟ تو جدید علوم وفنون نہ سیکھ کر ہم مسلمانوں کا کتنا نقصان کر رہے ہیں اور برٹش نوآبادیاتی کلچر کو ختم نہیں کر سکے نہ اسلامی قانون لا سکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری راہِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرے اور ہمارا حامی وناصر ہو۔

**مکاتیب**

## دینی جماعتوں اور تحریکوں کی انا پرستی

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ عرصے سے البرہان میں دینی سیاسی جماعتوں، دینی مدارس اور دینی تحریکوں اور اداروں کو اپنے کام کو موثر بنانے کے حوالے سے مشورے دیتے رہتے ہیں۔ بعض دوسرے احباب (مثلاً پروفیسر ملک محمد حسین صاحب اور محمد رشید صاحب) بھی اس کار خیر میں حصہ لیتے رہتے ہیں لیکن آپ ہی بتایئے کہ ان جماعتوں اور اداروں نے کبھی آپ لوگوں کے کسی مشورے کو توجہ سے سنا ہے؟ کبھی آپ کی ان تجاویز پر عمل درآمد کے حوالے سے آپ سے ڈائیلاگ کیا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ہماری بیوروکریسی اور حکمران خواہ مخواہ بدنام ہیں، ہماری ان دینی سیاسی جماعتوں اور دینی اداروں کے قائدین کی گردنوں میں بھی سریا کچھ کم نہیں ہے؟ یہ اپنے آپ کو عقل کل اور اپنے طریق کار کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ تکبر، انانیت، فرقہ پرستی اور جماعت پرستی نے ان میں اتنی صلاحیت ہی نہیں چھوڑی کہ یہ اپنی رائے سے ہٹ کر کوئی دوسری کام کی بات سوچ سکیں یا کسی کے مشورے پر کان دھر سکیں۔ ان کے مریدوں، کارکنوں اور خوشامدیوں نے ان کو اس طرح بانس پر چڑھا رکھا ہے کہ یہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اہلیت کھو بیٹھے ہیں۔

اللہ سے دعاء ہی کی جا سکتی ہے کہ وہ انہیں ہدایت سے نوازے۔ اگرچہ ان کے بگاڑ کے پیش نظر توقع نہیں کہ یہ سنبھلیں گے اور اپنی ناکامیوں سے کچھ سبق سیکھیں گے۔

پروفیسر طارق بٹ، کراچی

# طالبان، جہاد اور تعلیم

ماہنامہ البرہان کے شمارہ فروری میں آپ کے خیالات پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سچ بات یہ ہے کہ احساسِ تنہائی کم ہوا ہے۔ نظریاتی محاذ پر اس وقت سیکولر، روشن خیال اور لبرل چھائے ہوئے ہیں۔ اسلام پسندوں کی اکثریت بھی ''مفاد ونگ'' میں شامل ہو چکی ہے اور ماضی کے نامی گرامی نظریاتی اسلام پسند دانشور آج کل حق اور باطل کا آمیزہ بلکہ مرکب بنا کر قوم کو پلا رہے ہیں۔ ان حالات میں آپ کی طرف سے ایک خالص نظریاتی اور وہ بھی اسلامی موقف کھل کر پیش کرنا، یقیناً ہم جیسے افراد کے لیے بڑی تقویت کا باعث بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

''تعلیم اور افغان طالبان'' کے عنوان سے آپ نے جو مضمون شائع کیا ہے، اس بارے میں اتنا ہی عرض ہے کہ سیکولر روشن خیال پراپیگنڈے کی تحریک میں کذب بیانی بلکہ نوسر بازی کی تمام حدود کو پار کر چکے ہیں۔ ان کی نوسر بازی پر کوئی افسوس نہیں ہوتا، دکھ ان اسلام پسندوں کے رویے سے ہوتا ہے جو سیکولر روشن خیالوں کے پراپیگنڈے کے سحر میں گرفتار ہو کر اہل ایمان کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کا بھی کوئی خیال نہیں رکھتے۔ طالبان کے تعلیم دشمن ہونے کا پراپیگنڈہ بھی نوسر بازی ہے۔ صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ ایڈورڈ گیرارڈٹ اینڈ جوناتھن والٹر نے ''افغانستان'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب طالبان کی تعلیم دشمنی پر ہی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں جو تعلیمی اعداد وشمار دیے گئے ہیں، ایسا لگتا ہے دونوں مصنفین نے انہیں پڑھا نہیں، اگر وہ پڑھ لیتے تو کبھی نہ دیتے کیونکہ یہ اعداد وشمار ساری کتاب کو غلط ثابت کر دیتے ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق طالبان کے دورِ حکومت کے سال 2000ء میں طلبہ کے داخلوں میں 9 فیصد اضافہ ہوا جبکہ اسی سال طالبات کے داخلوں میں 12 فیصد اضافہ ہوا۔

**ملک احمد سرور**

(مدیر ماہنامہ چشم بیدار و ریزیڈنٹ ایڈیٹر ماہنامہ آفاق کینیڈا)

**شمع جلتی رہے**

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام............................................ پتہ ..................................................................

فون..................................................................................................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ھیں